

اُردو کے مزاحیہ ادب کی مقبول ترین کتاب

بجنگ آمد

کرنل محمد خان

ایک نیم نیشن کی شوخ و شنگ سرگزشت

بجنگ آمد

کرل محمد خان

واحد تقسیم کنندگان، مکتبه تعمیر السانیت اردو بازار، لاهور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

جولائی ۱۹۶۶ء	_____	بار اول
مئی ۱۹۶۸ء	_____	بار دوم
جون ۱۹۶۸ء	_____	بار سوم
فروری ۱۹۶۹ء	_____	بار چہارم
جون ۱۹۷۱ء	_____	بار پنجم
دسمبر ۱۹۷۲ء	_____	بار ششم
اکتوبر ۱۹۷۵ء	_____	بار ہفتم
اگست ۱۹۷۷ء	_____	بار ہشتم
مئی ۱۹۷۹ء	_____	بار نہم
مارچ ۱۹۸۲ء	_____	بار دہم

ناشر :- مکتبہ جمال - پوسٹ بکس نمبر ۳۹۹ راولپنڈی
 مطبع :- ایس. ٹی. پرنٹرز - راولپنڈی
 قیمت :- چالیس روپے



مصنف قیام و تساہرہ کے دنوں میں

انتساب

اُن تمام سیکنڈ لفٹینوں کے نام

جو

کبھی تھے، آج ہیں

یا

آئندہ ہوں گے۔

بالتا

ملاک و انبیاء و کرام

”جہاں رہو، خوش رہو“

قولِ عارف

کس کا ہمت

۱۱	سنگ	۶۱
۲۱	سپید کلبہ	۶۱
۳۱	سنگ و گداز	۵۵۱
۴۱	سنگ و گداز	۲۳۱
۵۱	سنگ و گداز	۲۶۱
۶۱	سنگ و گداز	۵۸۱
۷۱	سنگ و گداز	۵۹۱
۸۱	سنگ و گداز	۶۱۱
۹۱	سنگ و گداز	۶۲۱
۱۰۱	سنگ و گداز	۵۳۱
۱۱۱	سنگ و گداز	۵۴۱
۱۲۵	سنگ و گداز	۵
	سات دن سمندر میں	۶
	بصرہ اور شاہیہ کیمپ	۷
	صحرائے کیارہ اور برگڈ آفیسر میس	۸
	نیم لفظین بغداد میں	۹
	موصل سے طبرق: پندرہ سو میل کا سفر	۱۰
	جنگ سے پہلے	

ترتیب

۱۳۷	روزِ جنگ	۱۱
۱۳۷	پسپائی بسوئے مینا کیمپ	۱۲
۱۵۵	قاہرہ آیامِ جنگ میں	۱۳
۱۶۷	چند روز عہدِ مہم (قاہرہ) میں	۱۴
۱۹۷	مڈل ایسٹ سیکولر سکول معاوی (قاہرہ) میں	۱۵
۱۸۷	قاہرہ - آخری آیام	۱۶
۱۹۵	مراجعت بہ وطن	۱۷
۱۹۹	سیالکوٹ میں ایک سال	۱۸
۲۱۳	ویجائی سیکولر سکول کی کمان	۱۹
۲۲۵	برما: بربادی و بھالی میں ہمارا حصہ	۲۰
۲۳۵	برما سے پاکستان براہِ مدراس	۲۱

جناہ سرناخن

ضلع جلم کے سنگلاخ، نیلے بھورے کوہتانوں میں سمٹتی اور پھلتی ہوئی وادی، جس میں کرنل محمد خان پیدا ہو کر پروان چڑھے ہیں، ایک خاص وضع و انداز کے ”محمد خانوں“ کی سرزمین ہے۔ یہ حساب تو مجھے معلوم نہیں کہ محمد خان اول نے کس زمانے میں اس صہرتی پر قدم رکھا تھا؛ البتہ گردشِ ایام کی رکاب تمام کر جتنی دور بھی پیچھے کی طرف دوڑ سکا ہوں، ہر پشت کا پیشہ سپہ گری نظر آتا ہے۔ زراعت میں ملی ہوئی سپہ گری۔ اپنی مخصوص روایات میں دھن کا یہ دھنوان خطہ، جیلے سپاہی، جی دار کاشتکار اور جہان گندم و جو کے تابدار شگوفے پیدا کرنے کے لیے صدیوں سے مشہور و ممتاز چلا آتا ہے۔ آج بھی یہاں کا ہر محمد خان، قریب قریب محمد خان اول ہی کے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔ وہی تندرست و توانا محمد خان جس کا ایک ہاتھ ہل کی مٹھی پر رہتا ہے اور دوسرا قبضہ شمشیر پر۔ جو گھبرو ہونے پر یا علی کا نعرہ لگا کر پہلے ”موما“ پڑ کو ڈی“ کے لمبے چوڑے ”پڑوں“ اکھاڑوں میں دھو میں مچاتا ہے اور پھر دی پن کر ”ڈھول سپاہی“ کے رُوپ میں وطن عزیز کے مقدس پرچم کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیتا ہے۔ بالکا، جوی، جیالا؛ سحت جان و سحت کوش؛ — اگر گھروں کی پیشانی پر ”ماٹو“ لکھنے کا رواج ہوتا تو اس وادی کے اونچے نیچے، کچے پکے ہر گھر کے دروازے

پر نظری کا یہ مصرع مرقوم ہوتا۔

کے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ مانیت!

مگر یہ شیر دل لوگ "ماٹو" لکھنے کے بجائے اپنے خون سے زندگی کی تاریخ لکھنے کے قائل ہیں۔ شعر و ادب کا اُفتی یہاں ہمیشہ ہی سے کچھ دُھندلا دُھندلا سا رہا ہے۔ قبائے علم و ہنر یہ لوگ کم ہی پہنتے ہیں۔ پہنتے بھی ہیں تو جسم کے اوپر نہیں پہنتے، رُوح کے اندر پہنتے ہیں۔ کرنل محمد خان انہیں میں سے ایک ہیں۔ ماحول یا ورثے کے اعتبار سے ان کے ادیب بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، مگر وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی جنابندی! — تو ہمارے دوست محمد خان کی شخصیت کی تشکیل کو فطرت ہی کی "جنابندی" کا معجزہ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ ان کی ذات میں دو الگ الگ، لیکن اپنی اپنی جگہ پر بھرپور شخصیتیں کار فرما نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہی ہل اور تلوار والا محمد خان! کم سخن و کم آمیز! — نہ اولے کا فرائز نہ تراش آذرانہ! — کھیت میں جُٹ جائے، تو چٹانوں سے جوئے شیر کھینچ لائے۔ تلوار اٹھالے تو ننگوں کے نشمین تہ و بالا کر کے رکھ دے۔ وطن کا مان، ملت کی آبرو! — دوسرا محمد خان وہ ہے کہ اس سادہ مزاج سے دیہاتی نام سے اُس کے ذہن و فکر کی شادابی اور بُراقی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ادیب اور اِنشا پرداز محمد خان ہے۔ نرم دم گفٹگو، گرم دم جُستجو! چمن مشرب، بہار ایجاد! — خوش دل و گرم اخلاط، سادہ و روشن جبین! مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں محمد خان ایک دوسرے کی نفی نہیں، تائید کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کمک پہنچاتے ہیں، کیوں کہ دونوں کی جڑیں ایک ہی مٹی میں پیوستہ ہیں۔ محمد خان سپاہی ہو، کاشتکار ہو، ادیب ہو، دوست داری اور مہر و محبت میں دونوں یکساں گرمجوش ہیں۔ اخلاص و تحمل میں فرو اور انکسار کا تو یہ عالم کہ — نہ حد اس کے

پیچھے نہ خد سامنے!

دوسری جنگِ عالمگیر شروع ہوئی، تو علاقہِ دھنی کا یہ نیم لفظین اپنی روایات کے مطابق فوج کی صفوں میں شامل ہو گیا، لیکن یونیورسٹی کی اپنی تمام تر تعلیم کے باوجود وہ ہنوز ہل اور تلوار والا محمد خان ہی تھا۔ ایک مدت تک بصرہ اور شائبہ، بغداد اور موصل، قاہرہ اور طبروق میں گھومنے کے بعد جب وہ اپنے وطن میں واپس آیا تو ایک محمد خان کے جسم پر میدانِ جنگ کے تمغوں کی قطار سجی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سپاہیانہ صلابت کا وقار اور بانگین روشن تھا۔ یہ وہ محمد خان تھا جو اب کرنیل کی وردی میں نظر آتا ہے، لیکن اس عرصے میں اس کے اندر ادیب محمد خان بھی بیدار ہو کر بالغ ہو چکا تھا۔ ادیب محمد خاں الفیلی کی گلیوں اور مصر کے بازاروں اور شام کیارہ کے صحراؤں سے، ایک بھر پور سانولی سلونی اجنبی زندگی کے موتی رول لایا تھا۔ خواب، رنگ، روشنیاں، ستارے اور مسکراہٹیں! ایک سیلابِ بہار جس میں

رند جو طرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

”بجنگ آمد“ میں انہیں خوابوں، رنگوں، ستاروں اور مسکراہٹوں کی بارات فروزاں نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت اُردو ادب کے اہم واقعات میں سے ہے جس وسعت اور دلی گرمجوشی کے ساتھ اس کی پذیرائی ہوئی ہے، وہ اُردو کی بہت کم کتابوں کے حصے میں آئی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی، ابنِ انشا، سید عابد علی عابد، صفدر میر، مشفق خواجہ اور صدیق سالک اور کتنے ہی دوسرے اہل نظر اور اہل کمال نے جس انداز سے اس تخلیق پر داد و تحسین کے پھول نچا اور کیے ہیں، وہ ہر مصنف کے لیے قابلِ رشک اعزاز ہے، مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

”بجنگ آمد“ نے اُردو ادب کو مزاح کے ایک بالکل نئے اُفق کی تازہ ہوا اور کُتاوہ فضا سے آشنا کیا ہے۔ یہ کتاب زندگی کے لیے بیش بہا مَسرتوں کا خزانہ اپنے دامن میں کھتی ہے کرنل مُحمد خان کو ظرافت تک پہنچنے کے لیے کسی تُمید کا پُل ”نہیں باندھنا پڑتا۔ نہ وہ قہقہوں کے ”جزیرے“ آباد کرتے ہیں۔ واقعات کی گردن میں لطائف کی بجتی ہوئی گھنٹیاں بھی وہ آویزاں نہیں کرتے۔ اُن کا لطیف اور لچکیلا مزاح اُن کے اسلوبِ تحریر کا جزو ہے، اُن کے نقطہ نظر کی پیداوار ہے۔ ان کی ظرافت کسی دلاویز خیابان میں سنستی ہسکراتی، گنگنائی ہوئی ندی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے اور اپنے بہاؤ کے طلسم میں کناروں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ انسانوں کی طرح کتابیں بھی قسما قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً ”بزرگ کتابیں“ ”نادان کتابیں“ وغیرہ وغیرہ۔ ”بجنگ آمد“ ایک ”دوست کتاب“ ہے یعنی ایسی کتاب جس پر دل ٹوٹ کر آجائے۔ جس کے ساتھ وقت گزار کر آدمی دلی راحت محسوس کرے جس سے بار بار گفتگو کرنے کو جی چاہے۔ دوست، جو خوش رُو بھی ہے، خوش مذاق بھی، شوخ بھی ہے اور دلنواز بھی۔ ذہین بھی اور فطین بھی اور سنس مکھ اتنا کہ عجب دیکھیے ہونٹوں پہ سنسی آئی ہوئی سی!

یہ ”بجنگ آمد“ کی دوسری آمد ہے جس میں مصنف نے اپنے ترکش کے بعض نئے تیر بھی شامل کر دیے ہیں اور اس کی صورتی تزئین میں ہمارے ملک کے نامور اہل قلم اور مکتبہ اُردو ڈائجسٹ کے خوش ذوق مہتمم جناب الطاف حسن قریشی نے آسودگی خیال و نظر کا جو اہتمام کیا ہے وہ بجائے خود داد کا مستحق کارنامہ ہے۔ یہ کتاب اچھی تو تھی ہی اب پہلے سے زیادہ خوبصورت بھی ہو گئی۔

اور اب دیکھیے کرنل مُحمد خان کا اندازِ گل افشانی گُفتار!

۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء

سید ضمیر جعفری

۳۱۔ ڈی سٹاٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

مقدمہ

یہ کوئی ایسی معرکہ آرا یا انقلاب آور قسیم کی کتاب نہیں کہ اس پر مقدمہ دائر کیا جائے اور دراصل مقدمے کے بغیر ہی چھپنے جا رہی تھی کہ ہمارے ایک ٹیڈی مزاج دوست یحیٰٰن مرزا خفقان تشریف لے آئے اور مسودہ دیکھ کر کسی قدر طنزاً فرمانے لگے:

”تو یہ کتاب آخر چھپ کر رہے گی؟“

عرض کیا: ”کوئی اعتراض؟“

بولے: ”دو ہیں۔ ایک تو آپ فوجی ہیں، دوسرے آپ کا نام بھی کاشت کارانہ سا ہے۔ جب کام اور نام کا یہ عالم ہو تو لوگ بجا طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ آپ کو کتاب نویسی کا اشتغال کیسے آگیا۔ یعنی کیوں نہ اس کی بجائے ایک مورچہ کھود ڈالا یا دو چار بیگھے زمین جوت لی؟“

پھر خود ہی رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہنے لگے:

”چلو، تمہارا فوجی ہونا تو رن کچھ کے صدقے معاف کیا جاسکتا ہے، لیکن نام کا کچھ

علاج کرنا پڑے گا۔“

عرض کیا: ”آپ کی تشفیص ہے۔ آپ ہی علاج تجویز فرمائیں۔“

بولے: ”علاج آسان ہے۔ اسی نام کے آگے پیچھے یا درمیان کوئی پیار سا آپ ٹوڈیٹ

نام چپکالیں، مثلاً انجم۔ ارم۔ سحاب۔ سرخاب۔ سروش۔ سنتوش وغیرہ وغیرہ۔“

میں ابھی دل ہی دل میں محمد سنتوش خاں کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ خفقان صاحب بولے: ”لیکن پرانے نام کی مرمت سے بھی کیا فائدہ؟ اسے سرے سے ترک کر کے ایک دم ماڈرن نام کیوں نہیں رکھ لیتے؟ مثلاً شمشاد عشرت۔ ارشاد شمیم۔ ریاض طلعت۔ فردوس نسیم وغیرہ۔“

خفقان صاحب تو مشورہ دے کر تشریف لے گئے، لیکن ہمیں سوچا چھوڑ گئے اور سوچا ہم نے یہ کہ خفقان صاحب کے تجویز کردہ نام ماڈرن تو ضرور ہیں، لیکن ہیں ذرا مشکوک سے۔ یعنی ان سے زیادہ کاہی پتہ نہیں چلتا اور چل بھی جائے، تو ہر وقت کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں اٹھتے بیٹھتے یا انگریزی لیتے جنس میں ہی خلل نہ آجائے؛ چنانچہ ہر چند کہ ہمیں صنف لطیف کا احترام منظور ہے، بالفعل ہمیں صنف غیر لطیف میں ہی رہنے کا شوق ہے اور محض فیشن کی خاطر اپنا مردانہ مستقبل مخدوش نہیں کرنا چاہتے، لیکن خفقان صاحب کے اس سوال کا جواب دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے کا اشتعال کیسے آیا۔

خفقان صاحب قبلہ وہ یوں آیا: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میجر مسعود احمد مدیر ”ہلال“ نے اپنے اخبار کے ایک خاص شمارے کے لیے کچھ لکھنے کو کہا۔ ہم نے جلد بازی میں نہ صرف وعدہ کر لیا، بلکہ اپنے علم و فضل کی تیز روشنی سے قارئین ”ہلال“ کی آنکھیں خیرہ کرنے کے لیے اپنے موضوع کا بھی اعلان کر دیا۔ یعنی ”تعمیر کردار میں اقتضائے بشریت کی بوقلمونیاں“۔ لیکن بعد میں لکھنے بیٹھے تو عنوان کی تاباکی سے ہماری اپنی آنکھیں چندھیا گئیں اور کچھ لکھ نہ سکے۔ تاریخ وعدہ قریب آتی نظر آئی، تو ہمیں غیب سے ایک ایسا موضوع سوجھا جو ہمارے کام اور شاید نام سے بھی مناسبت رکھتا تھا یعنی یہ کہ ”ہم لفظین کیسے بنے۔“

○ اب لفٹنٹ کرنل مسعود احمد ڈائریکٹر انٹرنیشنل پبلک ریلیشنز۔

● دفاعی افواج کا ہفتہ وار مجلہ جو اس وقت روزنامہ تھا۔

یہ ایک طرح کا ادبی مورچہ ہی کھودنا تھا؛ چنانچہ ہم نے داغ اور ٹھپوں کی مشکہ مدد سے سوچا اور اپنے زورِ قلم اور زورِ بازو کے طفیل ایک مضمون بعنوان "لفٹینی" لکھ ڈالا۔ جو "ہلال" میں شائع ہو گیا۔ یہی مضمون اس کتاب کا پہلا باب ہے۔ چند ماہ بعد "ہلال" کا ایک اور خاص نمبر پھیننے لگا تو مدیر "ہلال" نے پھر یاد فرمایا۔ اب کے ہم نے دیانتداری سے کام لیا اور اقبال کر لیا کہ "ہمارے پاس ایک ہی موضوع تھا جو کام اچھا ہے اور اب ہمارے اندر مزید مضمون نگاری کا مادہ ختم ہو گیا ہے۔" لیکن جناب مدیر منس کر کہنے لگے:

"وہ موضوع ختم ہونے والا نہیں، لفٹینی سیکھنے کے بعد اسے استعمال بھی کیا ہوگا" بس ترکیب استعمال پر ہی کچھ لکھ دو۔"

سوچا تو یاد آیا کہ کچھ کیا تو تھا؛ چنانچہ وہی لکھ دیا۔ (ملاحظہ ہو باب ۲)

اس کے بعد "ہلال" کے خاص شماروں میں کمی آئی اور نہ ہماری لفٹینی کے کارناموں میں، حتیٰ کہ جنگ ختم ہو گئی۔ اب جو دیکھا تو ہمارا اعمال نامہ مرتب ہو چکا تھا۔ فرشتوں سے تو پہلے ہی کہاں چھپا تھا۔ اب انسانوں کی نظروں میں بھی آ گیا۔ سوچا کہ اب یہ حکایت عام ہوئی ہے۔ اب پردہ کیسا؟ اسے ایک جگہ جمع کر دو۔ آگے چل کر دائیں ہاتھ میں ملے گا یا بائیں ہاتھ میں کم از کم وزن کا اندازہ تو ہو جائے۔

خفقان صاحب نے دو خاص اعتراضوں کے علاوہ جاتے جاتے ایک عام حکمت کاموتی بھی بکھیرا تھا کہ جس کتاب کا کوئی MESSAGE یعنی پیغام نہ ہو اس کا چھپنا بیکار ہے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ کتاب لکھتے وقت ہم اپنی پیغامبرانہ ذمہ داریوں سے قطعی طور پر بے خبر تھے۔ ہمارے ذہن میں تو ایک ہلکی ہلکی لفٹین بیٹی تھی اور ہمیں گمان تک نہ تھا کہ ہم نسلِ انسانی کو کوئی ملکوئی قسم کا پیغام پہنچا رہے ہیں، بلکہ لکھنے کے دوران ہمیں کچھ احساس تھا تو فقط یہ کہ ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں؛ چنانچہ خفقان صاحب کے جواب میں ہمارا

فوری فیصلہ تو یہی تھا کہ ہمارا کوئی میسج "نہیں، لیکن ذرا غور کرنے پر ایک واقعہ یاد آ گیا جس سے شبہ ہونے لگا کہ ہماری کتاب شاید بالکل بے پیغام بھی نہیں۔

ہوایہ تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست اس کتاب کا ایک باب "ہلال" میں پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ پڑھنے کے دوران آپ ایک دو مرتبہ مسکرا دیے۔ اس معمولی سے واقعہ سے ہم نے نیوٹن کی طرح ایک اہم نتیجہ نکالا اور وہ یہ کہ اگر یہی کیفیت ہر قاری پر گزرے تو علم ریاضی کی رُو سے لازم آتا ہے کہ ملک میں مسکراہٹوں کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور مسکراہٹوں کا جو توڑا ہمارے ملک میں ہے اُس کا تو آپ کو علم ہی ہوگا۔ بیورلی نکلز (BEVERLY NICHOLS) نے اپنی کتاب VERDICT ON INDIA میں لکھا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں فی مربع میل ناخوشی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے؛ چنانچہ سوچتا ہوں کہ اگر اکثر خواتین و حضرات کی توجہ دوسرے مشاغل سے ہماری کتاب کی طرف بٹ جائے تو نہ صرف فی مربع میل ناخوشی میں کمی کا امکان ہے؛ بلکہ شاید فی مربع میل آبادی بھی گھٹنے لگے۔ بہر حال آبادی بڑھے یا گھٹے۔ کتاب کا پیغام ضرور ہے اور یہ وہی مشہور پیغام ہے جو ایک عارف ایفونی نے ایک کم عارف ایفونی کو صرف چار لفظوں میں دیا تھا۔ دونوں ڈسٹ ٹرنگ میں جا رہے تھے کہ کم عارف ایفونی کنوئیں میں لڑھک گیا۔ عارف نے دوست کو غائب پایا تو چلایا؛

"کہاں ہو دوست؟"

"کنوئیں سے فریاد اُٹھی؛" یہاں ہوں۔"

عارف نے فی البدیہہ پیغام دیا؛

"اچھا دوست جہاں رہو خوش رہو۔ اور آگے چل نکلا۔"

یہ کتاب ایک لفظین کی جنگ بیتی ہے۔ اس میں تصوف، فقہ یا علم الکلام پر پیدائنت

کوئی بحث نہیں کی گئی۔ اس میں صرف ان باتوں کا ذکر ہے جو سیکنڈ لفٹینوں کو اپنی زندگی،
 وصال جنگی زندگی میں پیش آتی ہیں۔ سیکنڈ لفٹینٹ اکثر جوان ہوتے ہیں اور جوانوں کے پہلو
 میں دل ہوتا ہے۔ وہی دل جو کئی بزرگوں کے پہلو میں پہنچ کر سنگ و خشت بن جاتا ہے نتیجہ
 یہ کہ نوجوانوں کی زندگی کے کئی زاویے بزرگوں کو چھتے ہیں، حالانکہ خود ان بزرگوں نے بھی جوانی
 میں انہی زاویوں پر خم کھایا ہوتا ہے۔ بہر حال ان محترمین کی خدمت میں پیشگی گزارش ہے کہ
 اس کتاب میں جہاں جنگ و جدل کا قصہ ہے وہاں عیش و سرور کی باتیں بھی ہیں۔ جہاں زہد و
 تقویٰ کا ذکر ہے وہاں ناؤ نوش کے قصے بھی ہیں۔ جہاں رکوع و سجود کا بیان ہے وہاں قصہ و سرد
 کی داستان بھی ہے اور جہاں مردانِ اصیل کے کارنامے ہیں وہاں زنانِ جمیل کے سرنامے
 بھی ہیں۔ اس تمام این و آں کے باوجود اگرچہ بظاہر اس کتاب میں کوئی ایسی چیز
 نہیں جو آپ کو غلط راہ پر ڈال دے؛ تاہم قارئین گرامی، اگر آپ نے پچھن سال مکمل کر کے سرکاری
 طور پر بزرگی حاصل کر لی ہے تو مناسب ہے کہ مطالعہ میں احتیاط برتیں۔ یعنی پڑھتے پڑھتے اگر
 آپ کی بزرگی پر کسی قسم کا دباؤ پڑھنے لگے، تو لازم نہیں کہ کتاب ختم کر کے ہی دم لیں، کتاب فوراً
 بند کر دیں۔ خود اس خاکسار نے بزرگوں کی لکھی ہوئی کئی کتابیں شروع کیں، مگر دیباچے سے
 آگے نہ گزر سکا اور کتاب کو ادب سے طاق پر رکھ کر دیوانِ غالب کھول لیا۔ آپ اس کی
 جگہ بہشتی زیور یا پکٹی روٹی کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یوں بھی زندگی کی ایک منزل پر پہنچ کر
 غیر آزمودہ کتابیں پڑھنا ٹھیک نہیں۔ کل کلاں ان کتابوں سے نکیرین نے کوئی ایسا سوال پوچھ
 لیا جس کا آپ سے جواب بن نہ پڑا تو بخشش میں ناحق پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ یہ جواب
 سیکنڈ لفٹینٹ نسبتاً آسانی سے دے سکتے ہیں، سو اگر آپ کسی وقت فوج میں رہ چکے ہوں
 یا کسی فوجی سے محبت کی ہے یا فقط صحبت ہی رہی ہے تو آپ کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔
 آپ جب چاہیں یہ کتاب بے کھٹکے پڑھ سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ نکیرین کے امتحان میں

کوئی سوال ایسا نہ پائیں گے جو سلیبس سے باہر ہو۔

اگر دیباچوں پر یقین کیا جائے تو شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہوگی جسے مصنف نے برضا و رغبت چھپوایا ہو۔ کتاب لکھی تو کسی نہ کسی طور جاتی ہے لیکن جب تک مصنف کے دستِ رشتہ دار اور مجملہ تاجرانِ کتب اُس کے پاؤں نہ پڑیں، کتاب چھپنے میں نہیں آتی بلکہ مشتاقانِ کتاب کا اصرار سال ہا سال جاری رہتا ہے، تا آنکہ مصنف آخر موت میں آکر ایک دن کڑوا گھونٹ پی کر کتاب چھپوانے پر راضی ہو جاتا ہے۔ قاعدے کی رُو سے بجنگ آمد کی طباعت کی داستان بھی کچھ یوں ہونا چاہیے تھی کہ جونہی کتاب کا آخری باب لکھا گیا، دوست احباب اپنا کام چھوڑ کر ہمارے آگے دست بستہ آ ملتی ہوئے کہ خدارا اب قوم پر احسان کرو اور اسے زیورِ طبع سے آراستہ کر ڈالو۔ جواب میں ہم نے پس و پیش کیا، تو وہ ایک وفد کی صورت مقامی ایم۔ این۔ اے کی سرکردگی میں ہمیں محض نامہ پیش کرنے آئے۔ ایک تیز طبع دوست نے بھوک بڑھال کر دی۔ دوسرے نے سر پھوڑ لیا؛ چنانچہ آخر اس ڈر سے کہ ان آبگینوں کو کیسی ایسی ٹھیس نہ لگ جائے جو قابلِ دست اندازی پولیس ہو، ہم نے جی کڑا کر کے کتاب چھپوانے کی غامی بھری۔ لیکن حضراتِ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسی واردات پیش نہیں آئی۔ کتاب چھپوانے کا فیصلہ ہم نے تنہا کیا ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ اس کے چھپنے میں کسی کے چوٹ نہیں آئی۔

دیباچوں کے آخر میں ایک سکہ بند مجملہ ہوتا ہے کہ اگر قارئین نے اس حقیر کی تصنیف کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا تو فقیر کو اطمینان ہوگا کہ پُر تقصیر کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ میرے بچوں میں یہ فقیر کی چالاکی ہے، بلکہ انکسار میں لپٹی ہوئی دہشت انگیزی ہے۔ دراصل فقیر جو کچھ کہنا چاہتا ہے، یہ ہے کہ خبردار جو کتاب پسند نہ کی ورنہ انجامِ بخیر نہ ہوگا۔ قاری عالی مقام! آپ پر اس کتاب کو پسند کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔ اگر آپ کو پسند آگئی تو ظاہر ہے کہ آپ

مستول آدمی ہیں اور اگر پسند نہ آئی، تو بھی آپ کا قصور نہیں۔ صرف ایک بات واضح ہو جائے گی کہ آپ نہ کبھی لفٹین تھے، نہ اب ہیں اور نہ آئندہ ہوں گے۔ اور لفٹین نہ ہونا بھی کوئی بُنیادی عیب نہیں۔ آپ ماشاء اللہ ٹھیکے دار ہو سکتے ہیں، جاگیر دار ہو سکتے ہیں، کارخانہ دار ہو سکتے ہیں اور اگر واقعی ہیں تو — اللہ آپ کی بچری زیادہ کرے — آپ کتابیں پڑھیں ہی کیوں؟ کتابیں پڑھیں آپ کے منشی!

آخر میں ہمیں چند احباب کا ذکر کر لینے دیں جو اس کتاب کے محاذ پر ہمارے دوش بڈش شریک جنگ رہے اور ذکر کرنا ہے ہمیں:

○ محمد اکرم کاجنوں نے مسودہ ٹائپ کر کے ثابت کر دیا کہ بدخطی لا علاج مرض نہیں۔

○ ماجد صدیقی اور مونس زبیری کاجنوں نے ٹائپ شدہ مسودے کی نہ صرف تصحیح کی بلکہ تزئین بھی کر دی۔

○ کرنل شفیق الرحمن اور میجر سید ضمیر جعفری کاجو فوجی ادیبوں کے سالاروں میں سے ہیں اور جنہوں نے بکمال سپاہی پروری اس ریکورڈ کی بھی رہنمائی کی اور نہ صرف فون پر کتاب کی مزاج پُرسی کرتے رہے بلکہ ایک دو مرتبہ بنفسِ نفیس اس کی نبض پر ہاتھ بھی رکھا اور ازراہ اشک شونی فرمایا کہ صحت بُری نہیں۔

○ کرنل مسعود احمد کاجنوں نے ابتدائی اشتعال کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ ان بے وضع اوراق کو اپنے حُسنِ تدوین سے کتاب بنا دیا اور آپ کو پیش کرنے کی جرات اور رخصت بخش۔

○ مندومی و مکرمی ڈاکٹر غلام جیلانی برق کاجن کے قدموں میں بیٹھ کر اُردو لکھنا سیکھا۔ اگر سکول میں ہمیں ایسا شفیق اور صاحبِ ذوق اُستاد نہ ملتا تو ہم ویسی صاحب بہادروں کی طرح ٹیڑھے مُنہ سے نیم فلط انگریزی بولنا تو شاید سیکھ لیتے،

لیکن اپنے قومی ادب کے ذوق سے محروم رہتے اور خدایا! کتنی بڑی نعمت سے محروم رہتے۔

○ اور عزیز قاری، آپ کا جو پڑھتے پڑھتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کے پہلو میں ایک زندہ اور جوان دل ہے۔ میں تجوی تو نہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لیے یہ سال اچھا ہے۔

جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

محمد خاں

مقدمہ ثانی

جناب ناشر کا ارشاد ہے کہ بجنگ آمد کے چھٹے ایڈیشن کی طباعت کے موقع پر کچھ لکھوں۔

عرض ہے کہ بحیثیت مصنف مجھے خوشی ہے کہ کتاب کو چھٹا ایڈیشن نصیب ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ قارئین نے اسے شرف قبول بخشا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی کتاب کی مقبولیت لازماً اس کی معقولیت کی سند نہیں — کئی اچھی کتابیں پہلے ایڈیشن سے آگے نہیں بڑھتیں — لیکن قبول عام بہر حال قدرت کا عطیہ ہے اور اس کی تحقیر کفرانِ نعمت ہے۔

سب سے بڑی نعمت جو یہ کتاب میرے لیے اپنے ساتھ لائی ہے وہ بشمار اور بے بہانے دوست ہیں۔ ان میں سے کئی تو اس قدر قریب آگئے ہیں کہ سوچتا ہوں یہ نہ ہوتے تو زندگی کس قدر بے رنگ ہوتی۔ لیکن ہزاروں ان دیکھے دوست بھی ہیں؛ وہ جو کبھی دو پیار کے لفظ لکھ بھیجتے ہیں لیکن بیشتر وہ جو کچھ کہے بغیر دل ہی دل میں یاد کر لیتے ہیں — مجھ جیسے بے مایہ شخص کے لیے اس سے بہتر کیا انعام ہو سکتا ہے؟ کسی غنی کے لیے بھی اس سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے؟

ویسے جہاں تک کتاب کی اصل قدر و قیمت کا سوال ہے وہ کچھ ہمارا دل ہی جانتا ہے اور یا محترمہ بیگم بھٹی کا جنہوں نے ہمیں ذیل کا خط لکھا ہے:

” محترم کرنل صاحب

آپ نے بجنگ آمد لکھ کر بڑا احسان کیا ہے۔ میرا بیٹا جاوید جو کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا، اب ہر وقت بجنگ آمد میں محو رہتا ہے۔ جاوید ماشاء اللہ بڑا قابل بچہ ہے۔ اس سال چوتھی جماعت کا امتحان دے رہا ہے!

کیا ہی اچھا ہو اگر آپ دو چار اور ایسی ہی کتابیں لکھ ڈالیں۔ اردو میں بچوں کے لٹریچر کی سخت کمی ہے۔

آپ کی ممنون

بیگم بھٹی۔“

محمد خاں

بل کسر۔ ضلع جہلم

۱۵ نومبر ۱۹۷۲ء

عشقِ لفظی و مشکلہا

ہمیں ہٹلر سے ہمیشہ شکایت رہے گی کہ اُس نے دوسری جنگِ عظیم شروع کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ نہ کیا۔ یہ نہیں کہ ہم موصوف کو اس کا رخیر سے روکنے کی کوشش کرتے ہم فقط اعلانِ جنگ میں دو مہینے کا التواء چاہتے تاکہ اپنی تعلیم پوری کر لیتے، لیکن ہم بمشکل گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر کالج پہنچے ہی تھے کہ آپ نے ہم سے بالابالا پولینڈ پر چڑھائی کر دی جس کا بعد میں ہمارے ذاتی پروگرام پر خاصا گہرا اثر پڑا۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں ہر چند کہ پولینڈ اور ہٹلر کے دوسرے ہمسائے جرمن بمباروں اور ٹینکوں کے درمیان ایسی پُرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے تھے؛ تاہم باقی دُنیا بفضلِ خدا خیریت سے تھی اور ہمارے اپنے ملک ہندوستان میں تو انگریز کی برکت سے اس شدت سے امن برپا تھا کہ شیر بکری مع جملہ ہندوستانیوں کے ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے؛ چنانچہ صلح و آشتی کے اس خوشگوار ماحول میں کسی کو گمان تک نہ تھا کہ عین اس وقت ملک کے ایک گوشے میں ایک اہم جنگی واقعہ کی ابتداء ہو رہی ہے، یعنی لاہور میں ایک نوجوان کالج چھوڑ کر جنگ میں کود پڑنے پر تُل گیا ہے۔ یہ نوجوان میں ہی تھا۔

۱۔ اُس وقت پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

لیکن بھرتی ہونے سے نہ تو ہٹلر کی دلازاری مقصود تھی، نہ انگریز کی دلجوئی۔ ہمارے مراسم دونوں سے دوستانہ تھے۔ ہمیں فقط لفٹین بننے کا شوق تھا اور قدرت اور ہٹلر نے بل کر اس شوق کی تکمیل کا سامان پیدا کر دیا تھا؛ چنانچہ ہم نے فوج میں کمیشن کے لیے درخواست دے دی۔

اُن دنوں ابھی وہ مصیبت نازل نہیں ہوئی تھی جسے آج کل سلیکشن بورڈ کہتے ہیں۔ انٹرویو تو خیر اُن دنوں بھی ہوتے تھے، بلکہ ایک چھوڑتین تین، لیکن نہایت شریفانہ قسم کے۔ ایک بزرگ ساجرنیل اور کچھ نیم بزرگ سے برگڈیر اور کرنل بیٹھے ہوتے تھے۔ سامنے کرسی پر امیدوار کو بٹھا دیا جاتا تھا اور پھر اُس سے نہایت بے ضرر سے سوال پوچھے جاتے تھے:

آپ کا نام کیا ہے؟
تعلیم کہاں تک ہے؟

فوج میں کوئی رشتہ دار ہے؟ وغیرہ وغیرہ

اور ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہر چند کہ کچھ خاندانی اسرار فاش کرنا پڑتے تھے، لیکن دماغ پر ایسا ناگوار بوجھ نہ پڑتا تھا کہ اٹھائے نہ اٹھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہلکا پھلکا اور خاصا مفرح قلب سا انٹرویو ہوتا تھا۔ ان دنوں نہ تو امیدواروں کی ذہانت کی پیمائش کی جاتی تھی نہ اُن کے لاشعور کی تلاشی لی جاتی تھی۔ یہ بدعتیں چند سال بعد کی پیداوار ہیں۔

چنانچہ ہمارے دو انٹرویو جہلم اور پنڈی میں ہوئے اور ہم کامیاب رہے۔ آخری انٹرویو کے لیے حکم ملا کہ فلاں تاریخ شملہ حاضر ہو جاؤ۔ یہ سن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر آخری انٹرویو میں کامیابی نصیب ہو جائے، تو انسان فی الفور لفٹین بن جاتا ہے

۱۔ لفٹنٹ

اور باقاعدہ لفٹینی کرنے لگتا ہے۔ اس بات کا علم نہ تھا کہ آخری انٹرویو اور لفٹینی کے درمیان ٹریننگ کا ایک خاصا ٹھک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم ایک نیم لفٹینی کے عالم میں شملہ روانہ ہوئے اور جب انٹرویو ہو چکا، تو ہمیں محسوس ہوا کہ اب کسی لمحے سالم لفٹین ہوئے۔ کیونکہ انٹرویو تسلی بخش قسم کا ہوا تھا۔ ہم میں کوئی ایسی بنیادی خامی بھی نہ تھی۔ تعلیم کی شرط میٹرک تھی اور ہم نے تو میٹرک کے علاوہ کافی فالتو تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ ہمارے خاندان کی فوجی خدمات کی فہرست بے شک ایسی طویل نہ تھی، لیکن ہم نے شجرہ نسب کو تھوڑا سا کھینچ تان کر اس قدر صوبیدار چچوں اور کپتان چچا زادوں کا احاطہ کر لیا تھا کہ جرنیل صاحب کو مطمئن کرنے کے بعد کچھ بچ بھی گئے تھے۔ بہر حال یہ راز ہمارے اور خدا کے درمیان ہی تھا۔ پولیس کی طرف سے صفائی کی بھی شرط تھی، تو ہم یوں بھی کبھی امن عامہ میں مخل نہیں ہوئے تھے، لیکن چونکہ پولیس والے بھی آخر انسان ہوتے ہیں، لہذا ہم نے احتیاطاً ان کی انسانیت کا تقاضا بھی پورا کر دیا تھا۔

شملے سے گھر پہنچے، تو لفٹینی کے حکم کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ ادھر خدیجہ عجلت سپند بزرگوں نے ہماری لفٹینی کے اعزاز میں پیشگی دعوتیں دینا شروع کر دیں۔ جنہیں ہم واجبی بر خورداری مگر افسرانہ وقار کے ساتھ قبول کرتے رہے۔ آخر ایک دن ڈاکیہ کھلا تار لے کر آیا اور دُور ہی سے بولا: "لفٹین صاحب، لفٹینی مبارک ہو۔"

لیکن تار پڑھا تو فقط اتنا لکھا تھا: "تمہیں او۔ٹی۔ ایس مہو میں ٹریننگ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ ۸ اگست ۱۹۴۰ء کو حاضر ہو جاؤ۔"

یہ پڑھ کر کچھ مایوسی تو ہوئی، لیکن پھر سوچا کہ آخر لفٹینی ہے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ یوں اٹھا کر بانٹ دی جائے۔ اس کے کچھ ادبی آداب سکھانے ہوں گے، کچھ خفیہ گرتا نے ہوں

اے او۔ٹی۔ ایس سے مراد آفیسر ٹریننگ سکول ہے جو ابتدائے جنگ میں مہود (وسط ہند) میں کھولا گیا تھا۔

گے کہ لفٹینی چلائی کیسے جاتی ہے؛ چنانچہ خوشی خوشی دوستوں سے رخصت ہوئے۔ ہر طرف سے لفٹین صاحب کہہ کر پکارا جا رہا تھا جو ہمیں بے حد گوارا محسوس ہونے لگا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نشست و برخاست اور لب و لہجہ سے بھی لفٹینی ٹپکنے لگی۔

ریل کے سفر کے لیے درجہ اول کا ٹکٹ ملا۔ یہ بھی ہماری عالیجاہی کی علامت تھی ٹکٹ دیکھنے والے ڈبے میں داخل ہوتے تو سر کہہ کر خطاب کرتے۔ خدا جانے انہیں کیسے محسوس ہو جاتا کہ یہ عام آدمی نہیں، لفٹین ہے۔ بہر حال ہم ان سے وہی سلوک کرتے جو ایک افسر کو درمیانہ درجے کے سرکاری ملازم سے کرنا چاہیے۔ ہم سفروں میں انگریز بھی تھے۔ یہ لوگ اگر ہم سے بولنا چاہتے تو پہلے کہتے: "معاف کیجیے گا" اور پھر عرضِ مدعا کرتے۔ ہمیں نہ صرف اپنی لفٹینی کا لفٹین ہو گیا، بلکہ اس کی بلندی کا بھی احساس ہونے لگا؛ چنانچہ دلی سے آگے جب گاڑی میں ہم ایسے لفٹینوں کی تعداد کافی ہو گئی، تو موضوع گفتگو زیادہ تر یہی رہا کہ لفٹینی اور کپتانی میں آخر فرق کیا ہے؟ اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ معمولی فرق ہے؛ چنانچہ رتلام اور مہو کے درمیان ہمارا مزاج عرشِ معلیٰ سے کچھ ہی ادھر تھا، بلکہ کئی ایک تو دبی زبان سے یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آخر ان تاریخ دانوں نے پولین کو کیوں سرچڑھا رکھا ہے!

آخر مہو کا ٹیشن آگیا۔ توقع تھی کہ ہمارے استقبال کے لیے فوج کا دستہ آئے گا، بند ہوگا، موٹریں ہوں گی جن کے ڈرائیور ہمارے لیے دروازہ کھولیں گے، اور باادب با ملاحظہ ہمیں اپنے بنگلوں تک پہنچادیں گے، لیکن دیکھا تو یہاں کا بند و بست کسی قدر مختلف نظر آیا۔ استقبال کے لیے آدمی تو تھے، لیکن ان میں ایسی وافر آدمیت نہ تھی۔ گاڑی رکی تو ہمارے ڈبے میں ایک گورا داخل ہوا۔ جس کے بازو پر تین سفید دھجیاں لگی تھیں۔ آتے ہی بولا:

"اگر اس ڈبے میں کوئی کیڈٹ ہے تو ابھی مت باہر نکلے۔"

ہم بیٹھ تو گئے، لیکن اس گورے کی زبان بے حد کھردری لگی۔ علاوہ ازیں کیڈٹ کا لفظ

سُن کر کچھ تشویش سی ہوئی کہ ہم سے کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا۔ لفٹین تو لفٹین ہوا، یہ کیڈٹ کیا جنس ہے؟ چنانچہ ہمیں ذرا پختہ سا شبہ ہونے لگا کہ ان انگریزوں نے لفٹینی سے وصل کی کچھ خفیہ سرگرمیاں بھی مٹھا رکھی ہیں جن سے ہمیں پہلے آگاہ نہیں کیا گیا۔

جب سٹیشن دوسرے مسافروں سے خالی ہو گیا، تو گورا پھر آیا اور ہم سب کو گاڑی سے باہر نکلنے کا گستاخانہ سا حکم دیا۔ باہر نکلے، تو دوسرے ڈبوں سے بھی تیس چالیس ہم جنس حضرات نکلتے دکھائی دیے۔ سٹیشن پر تین چار اور گورے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک جو بظاہر سینئر تھا، اچانک چلا آیا:

”سب کیڈٹ میرے سامنے قطار میں کھڑے ہو جائیں۔“

ہم نے کسی قدر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کچھ بے دلی سے قطار بھی بنائی۔

گورا پھر چیخا:

”دائیں سے ایک دو تین بولو۔“

ہم نے حکم کی تعمیل تو کی، لیکن محسوس ہوا کہ یہ سلوک ہماری شان کے شایاں نہیں۔ آخر ہم رنگ روٹ تو تھے نہیں جو قطاریں بناتے پھرتے یا گنتی شروع کر دیتے۔ بہر حال ہمیں تین ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر وہی گورا بولا:

”باہر تین ٹرک کھڑے ہیں، ہر ٹولی ایک ایک ٹرک میں سوار ہو جائے۔“

ہمیں یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کچھ بھی ہو، ہمیں ٹرکوں میں لے جانا شدید غلطی بلکہ بے ادبی ہے، موٹر کاریں ہونا چاہیے تھیں، مگر سوچا کہ ان معمولی ٹامیوں سے الجھنا ہمیں زیب نہیں دیتا؛ چنانچہ ہم نے قلیوں کو آواز دی کہ ہمارا سامان ٹرکوں میں ہی رکھ دیں۔ ہمارا یہ کہنا تھا کہ گورا اگر ج کر بولا:

”کیا کما، قلی؟ تم فرجی سکول میں آئے ہو۔ ہسپتال میں نہیں۔ اپنا سامان خود اٹھاؤ، ٹرکوں

میں لادو اور اوپر بیٹھ جاؤ یا کھڑے رہو سمجھے؟“

سمجھ تو آگئی اور ہماری خوش فہمیوں پر کچھ اوس بھی پڑی، لیکن ہم سب نے حتی المقدور جلال میں آکر اس بے ادب ٹامی کو گھرے اور متفقہ غضب سے دیکھا اور کھڑے کھڑے فوجی زندگی کا پہلا فیصلہ کر ڈالا کہ جو نہی لفظین ہو گئے اس گستاخ گورے کا کورٹ مارشل کر دیں گے۔ اس دیرانہ فیصلے پر ہر طرف سے مرجبا کی صدا اٹھی۔ اس وقت ہم کورٹ مارشل کو مارشل کا قریبی رشتہ دار سمجھتے تھے۔ اور گورے کے مستقبل کو دل ہی دل میں تباہ کر کے ٹرکوں پر سوار ہو گئے۔

منزل مقصود کی جھلک توقعات سے بہت غیر مشابہ تھی۔ ہماری جائے قیام کے خدو خال بنگلے کی نسبت جیل سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ ایک سنگین بلکہ سنگدل سی بارک تھی، تنگ و تاریک اور طویل جس کے اندر دیواروں کے ساتھ آہنی چارپائیاں پڑی تھیں اور چارپائیوں پر ہمارے ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں جھٹکا سا لگا۔ گورا جیسے ہمارے خوف کو بھانپ گیا اور کڑک کر بولا:

”یہ تختیاں گلے میں لٹکانے کے لیے نہیں، محض تمہاری نشستوں کے تعین کے لیے ہیں۔ اب اپنی اپنی چارپائیاں ڈھونڈ لو اور اپنا سامان وہاں اٹھا کر لے جاؤ۔“

ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ سامان اٹھانے اور چلنے پھرنے میں حُستی دکھاؤ اور شور مت کرو۔ ہمیں یہ آخری حکم خاص طور پر ناگوار گزرا۔ ہم نے پُرانے فوجیوں سے سُن رکھا تھا کہ یہ لفظین لوگ ہر وقت گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے رہتے ہیں۔ انہیں زبان بندی کا حکم دینا چھوٹے منہ کی بہت بڑی بد تمیزی ہے۔ ایک حضرت بولے: ان جاہل گوروں کو کیا معلوم کہ ایک لفظین کرنے پر آئے تو کیا کچھ کر سکتا ہے، لیکن کچھ سوچنے کے بعد ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ کورٹ مارشل تک باوقار خاموشی اختیار کرنا ہی قرین مصلحت ہے۔

شام ہوئی تو کھانے کے لیے MESS میں گئے۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں سے لفٹینی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم سب ایک افسرانہ مٹھاٹھ سے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مؤدب اور باوردی بیروں نے ہماری خواہش کے مطابق مشروبات پیش کیے۔ اس خوشگوار ماحول میں ہم نے سٹیشن اور بارک کے اُن ناخوشگوار واقعات کو بھلا دیا جو اُن گھٹیا خاندان کے گوروں سے سرزد ہوئے تھے اور ایک سرور کے عالم میں باہم گرت پرت گرت کرنے لگے۔ اتنے میں دو خوش لباس انگریز اندر داخل ہوئے۔ یہ بھی فوجی وردیاں پہنے ہوئے تھے، لیکن ان کے بازوؤں پر تین دھجیاں نہ تھیں، بلکہ کندھوں پر پتیل کے تین تین چمکتے ستارے تھے۔ یہ افسر تھے اور وہ سارجنٹ۔ ان کی وضع قطع، بات چیت اور طور طریقوں میں شائستگی اور وقار تھا۔ اُنہیں دیکھا تو فخر سا محسوس ہوا کہ اصولاً ہم اور یہ افسر ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ آج نہیں تو کل ہمارے کندھوں پر بھی وہی جگمگ کرتے ستارے اُبھرنے والے تھے۔

مٹھوڑی دیر کے بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لیے گئے۔ انگریزی کھانے اور دسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اُردو بولنے میں ہے جس طرح ایک نوآموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں، اُسی طرح ہمارا انگریزی "مٹر گوشت" بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا۔ ادھر ہاتھوں سے کھانا خلاف شان تھا، لیکن برضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا؛ لہذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جاتے تو اُردو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے۔ اسی طرح جہاں انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ چلتا، ہم آنکھ بچا کر انگلیوں سے ہی بوٹی اُچک لیتے۔ گویا انگریزی کھانا اُردو میں کھا لیتے۔ بعض حضرات البتہ ایسے بھی تھے جو لفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اُتارتے ہی نہ تھے۔ ان میں سے کئی ایک کو دیکھا کہ چھری کانٹا لیے پلیٹ میں مٹروں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مٹر ہیں کہ

ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اُدھر نکلے! قصہ مختصر پیشتر اس کے کہ ان مومن مٹروں کو کوئی گزند پہنچتا، بیرے پلٹیں اُٹھا کر چل دیے اور لفٹین صاحبان اپنا سامنہ اور ٹھپری کاٹا لے کر رہ گئے۔ بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ بیرا جو کچھ سامنے رکھ گیا ہے، اس کے ساتھ سلوک کیا کرنا ہے؛ چنانچہ کافی آنکھ سے اُن انگریزوں کو دیکھتے اور تیچھے اُن اماموں کے چمچے اور کانٹے اُٹھا کر رکوع و سجود میں جاتے۔

کھانا ختم ہوا تو انٹی روم میں آئے اور کافی کا دور چلا، لیکن تھوڑی دیر بعد دونوں انگریز کپتان اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ خوشگوار مجلس برخاست ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے در چشم زدن صحبتِ یارِ آخر شد۔ وہاں سے اُٹھ کر بارک میں واپس آئے، تو وہی بد زبان گورا پہلے سے موجود تھا۔ سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

”کل صبح سات سو بجے پی۔ ٹی کے میدان میں حاضر ہونا ہے۔ لباس، بنیان، بکڑ

اور ربڑ کے جوتے۔“

اور اتنا کہہ کر اڑتا ہوا چل دیا۔ گویا یہ گورا باز نہیں آ رہا تھا۔ وہی حرکتیں کرتا تھا جو لفٹینی کے منافی تھیں۔

کسی نے پوچھا: ”ارے یار یہ سات سو بجے کس بلا کا نام ہے؟“

ایک صاحب بولے: ”بے معنی بات ہے۔ گورا انگریزی غلط بولتا ہے۔“

ایک فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا: ”اس کے معنی ہیں صبح سات بجے۔“

دن بھر کے تھکے تھے۔ صبح تیار ہوتے ہوتے ہم سے کئی ایک پی ٹی کے لیے سات

بجے سے ایک دو منٹ بعد پہنچے۔ کالج میں ہم گھنٹوں دیر سے پہنچا کرتے تھے اور اگر پروفیسر

صاحب کے ماتھے پر ایک آدھ ہلکی سی شکن آجاتی، تو لمحے بھر میں بغیر استری کے ہموار بھی ہو جاتی

○ فزیکل ٹریننگ یعنی ورزش

تھی، کہ اس گورے نے جو ہمیں ذرا دیر سے آتے دیکھا، تو کچھ اس انداز سے چلایا، گویا بھونچال آگیا۔ رہیں اُس کی پیشانی کی شکنیں، تو ان کی اصلاح کے لیے استری کی بجائے روڈ رولر درکار تھا۔ معلوم ہوا کہ گورا محض پھٹ ہی نہیں گیا، کچھ بول بھی رہا ہے، لیکن اس کی انگریزی اُس انگریزی سے بہت مختلف تھی جو ہم نے کتابوں میں پڑھی تھی۔ گورے کے الفاظ تو خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے، لیکن ان کی تاثیر ہمارے دلوں میں آنا فانا سرائت کر گئی کیونکہ اس کے ہر لفظ کے ساتھ ہماری رہی سہی لفظی بتدریج زائل ہو رہی تھی۔

ہم خاموشی سے قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور پی ٹی شروع ہوئی۔ پہلے تو ہمیں میدان کے ارد گرد دوڑایا گیا یعنی ڈبل کرایا گیا۔ (ڈبل کے یہ معنی ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوئے) بعد ازاں چند ایسے زاویوں پر جھکنے کا حکم ملا جو فطرت کی منشاء کے سراسر خلاف تھے۔ کوئی ادھ پون گھنٹے کی پی ٹی کے بعد ہم تسخیرِ فطرت میں تو کسی قدر کامیاب ہو گئے، لیکن ہماری اپنی ترکیبِ عناصر میں خاصا خلل آگیا۔

آخر پی ٹی ختم ہوئی اور حکم ہوا کہ ناشتہ کے بعد پھر ہمیں حاضر ہونا ہے اور وقت نو سو تیس بجے کا ملا۔ فوجی کیڈٹ سے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ صبح کے ساڑھے نو بجے مراد ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کھلا کہ یہ گورا اپنی سارجنٹ میجر ہے جس کی نافرمانی ایک کیڈٹ کی عاقبت کے لیے سخت مضرت ثابت ہوتی ہے۔

ناشتہ کے بعد جب میدان میں پہنچے، تو سارجنٹ میجر کو غیر حاضر پایا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ غیر حاضر نہیں، ہم ہی وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔ گویا فوجی ضبط کی پہلی خوراک ہی اس قدر زود اثر نکلی۔ صبح وقت پر سارجنٹ میجر نمودار ہوا، تو اپنی فتح پر ذرا مسکرایا، لیکن فوراً منجمد ہو گیا اور ہمیں حکم دیا کہ کوارٹر مارٹر سٹور میں جا کر اپنے اپنے ساڑز کے بوٹ لے آؤ۔ بوٹ دیکھے تو محسوس ہوا کہ ہمیں پہننے کو وہ چیز دی جا رہی ہے جو گینڈوں کے پاؤں

کے لیے زیادہ موزوں ہے اور جب پہن کر دو چار قدم چلنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے ناگیا پر بت گھسیٹ رہے ہیں۔ فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا کہ ان بوٹوں کے ساتھ تو ڈبل بھی کرنا پڑے گا۔ یہ سنا تو تمام سلسلہ قراقرم سر پر اُپڑا۔

دو تین دن خاکی کپڑوں کی تیاری میں صرف ہو گئے اور ٹریننگ کے سلسلے میں فقط پنی ٹی ہوئی، لیکن جب خاکی یونیفارم تیار ہو گئی اور ہم نے بوٹ پٹی پہننا سیکھ لیا، تو باقاعدہ ڈرل شروع ہوئی۔

ڈرل کے آغاز سے پہلے کپتان صاحب نے ہماری TURN-OUT یعنی یونیفارم وغیرہ کا معائنہ کیا اور معائنہ کیا کیا، گویا ہمیں خرد بین کے نیچے رکھ دیا۔ وہ عیب بھی ڈھونڈ نکالے جو درمیانہ قابلیت کا فرشتہ بھی نہ دیکھ پاتا، یا دیکھ بھی لیتا، تو نظر انداز کر دیتا۔ ہم نے ڈرل میں شرکت سے پہلے فوجی کیڈٹ کو بوٹ، پٹی، نمبر، بٹن، پیٹی، فلیش وغیرہ دکھالی تھی، لیکن کمپنی کمانڈر صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی جیسے پہچان لیا اور فرمایا:

”کیڈٹ نمبر ۱۵، کالر پر ایک سفید ذرہ INCORRECTLY DRESSED

سزا: تین ایکسٹرا ڈرل۔“

سارجنٹ میجر نے جو کاپی پنل لیے کمپنی کمانڈر کے اشادات قلب بند کر رہا تھا فوراً ہمارے اعمال نامے میں ہماری سزا کا اندراج کیا۔ کم و بیش ایسا ہی حشر ہر کیڈٹ کا ہوا۔ حتیٰ کہ بیچارے فوجی کیڈٹ بھی نہ بچ سکے جو بظاہر سپاہی یونیفارم میں ہوئے تھے۔

اس کے بعد ڈرل شروع ہوئی اور خوب تیزی اور تندہی سے حکم ملنے لگے:

”سیدھے دیکھو۔ چھاتی باہر۔ ٹھوڑی اوپر۔ بازو ہلاؤ۔ ہالٹ۔ ہلو مت۔ بکھی مت

○ ایکسٹرا ڈرل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، معمولی لغزشوں کی سزا کے طور پر پچھلے پر کرائی جاتی

تھی۔ یعنی جب دوسرے لوگ تفریح میں مشغول ہوتے تھے۔ خاصی عذاب ناک چیز تھی۔

اڑاؤ۔ مہسومت“ وغیرہ وغیرہ۔

ان سب میں "ہلومت" کے حکم پر عمل کرنا عذابِ عظیم تھا۔ سیدھے بت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھجلی محسوس ہوتی ہے۔ اب ہاتھ کو جنبش دینا جرم ہے۔ کندھا کان تک نہیں پہنچ سکتا۔ کان کا خود ہلنا منٹائے فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا منٹائے سارجنٹ نہیں۔ عین اس وقت ایک مکھی ناک پر نازل ہوتی ہے۔ مکھی کو فنا کرنے کی بے پناہ خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن سارجنٹ سے آنکھ بچانا کرنا کاتبین سے آنکھ بچانا ہے۔ مکھی پر دست درازی کا خیال آتا ہے، تو سارجنٹ گویا ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے اور اپنی کانگریزی میں چلا اٹھتا ہے: "DON'T KILL NO FLY" یعنی مکھی مت مارو۔ ہاتھ وہیں کا وہیں سوکھ جاتا ہے اور مکھی نہایت اطمینان سے ناک کے نشیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے۔ ایسے اشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کشی تھی۔ اس وقت زندگی کی واحد خواہش صرف اتنی ہوتی کہ کب ڈرل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان کھجائیں اور بالآخر جب ڈرل ختم ہوتی اور ہم بلا خوفِ تعزیر کا نزل کو چھو سکتے اور مکھیوں کو اڑا سکتے، تو ہمیں محسوس ہوتا کہ کان کھجانا اور مکھی اڑانا بھی کس قدر عظیم عیاشی ہے، بلکہ اسی خوشی میں وہ آبلے بھی بھول جاتے جو ان آہنی بوٹوں کے اندر ہی بنتے اور چھوٹتے تھے۔

لیکن اس بے دریغ ڈرل کا ایک پہلو ضرور تھا جس نے اس کی درستی کو گوارا کر دیا تھا اور وہ تھیں سارجنٹوں کی لاتناہی پھبتیاں جو وہ بے بس کیڈٹوں کی حرکات پر کتے تھے۔ سارجنٹوں نے نسلاً بعد نسل اس موضوع پر ایک بسیط و دلپذیر لٹریچر چھوڑا ہے جو اپنی تابکاری کی وجہ سے زیورِ طبع سے تو شاید کبھی آراستہ نہ ہوگا، لیکن اس ادبِ عالیہ کے تلف ہونے کا

○ لندن کے غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان۔

بھی ایسا خطرہ نہیں، کیونکہ یہ شہ پارے بشمار سپاہیوں کے توانا سینوں میں محفوظ ہیں۔ ایک دن ڈریل کرتے ہوئے میرے ساتھ کے کیڈٹ نے پھرتی سے دو تین غلطیاں کر دیں۔ تیسری غلطی پر سارجنٹ کا رنگ پہلے لال، پھر پیلا اور بالآخر نیلا ہوا۔ ایک لمحہ کے لیے جہاں کھڑا تھا، وہیں رُک گیا۔ پھر باقی دُنیا دماغ سے قطع نظر کرتے ہوئے خطا کار کیڈٹ کی طرف بڑھا۔ جب سارجنٹ اور کیڈٹ کا درمیانی فاصلہ صفر تھا۔ یعنی دونوں کی ناکیں چھو رہی تھیں، تو سارجنٹ الفاظ پلپس پلپس کر اپنے شکار سے یوں مخاطب ہوا:

”میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، ضبطِ تولید سراسر جائز معلوم ہونے لگتا ہے۔“
ہنسی کے بے پناہ ریلے سے ہمارے منہ کھلنے ہی والے تھے کہ سارجنٹ کے منہ سے ”ہنسومت“ کا ایٹمی دھماکہ برآمد ہوا۔ ہم نے دانت تو بھینچ لیے، لیکن ہماری اندرونی کیفیت وہ ٹاڑھی سمجھ سکتا تھا جس کے پھٹنے میں تھوڑی سی مزید ہوا کی ضرورت ہو۔
بد قسمتی سے ہم میں سے ایک کیڈٹ ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار کھلکھلانے لگا۔ یہ سارجنٹ کے لیے دوسرا چیلنج تھا۔ اب کے ذرا بلند آواز سے مجرم سے مخاطب ہوا اور اسی پُرانے مضمون کو نئے جامے میں پیش کیا:

”ذرا آپ ہی بتائیں کہ آپ نے پیدائش کی زحمت کیوں گوارا کی؟“

کیڈٹ ذرا کھسیانا ہو کر نیچے دیکھنے لگا، تو سارجنٹ گرجا:

”اوپر دیکھو، زمین کا معائنہ بھنگی صبح سویرے کر چکا ہے۔“

کیڈٹ سارجنٹ کی یورش سے لڑکھڑایا اور اضطراب میں آسمان کی طرف دیکھنے

لگا۔ اس پر سارجنٹ دوسرے کیڈٹوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

”ذرا دیکھنا، اب یہ حضرت براہِ راست خدا سے آرڈر لینا چاہتے ہیں۔“

پھر کیڈٹ کی طرف مڑ کر چلایا:

”میری ناک کی سیدھ میں دیکھو، خدا بہت بلند لیول پر ہے۔“

پریڈ کے بعد اس کیڈٹ کا وزن خاصا ہلکا ہو چکا تھا۔

ڈرل کے بعد تمام پیریڈ پڑھائی یا پستول اور مشین گن وغیرہ کی سکھلائی کے تھے۔

اگرچہ پیکروں کے کمروں تک جانا بھی چپ راست یا ڈبل کے تابع تھا؛ تاہم کمروں کے اندر

دست و پا کی حرکات پر پابندی نہ تھی۔ مثلاً مکھی یا مچھر سے تحفظ ہمارے بس کی بات تھی۔

ان کی ناجائز پرواز پر ہم حسب ضرورت ہاتھ پاؤں ہلا سکتے تھے اور فقط اتنی سی آزادی

سے زندگی میں کیف باقی تھا۔

رات کو ڈیز پر گئے تو ذکر اس موضوع پر نہ تھا کہ ہماری لفیٹنی کس مرحلے پر ہے بلکہ

یہ کہ ڈرل میں کبھی ناغہ بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ فوجی کیڈٹ کے اس انکشاف پر کہ اتوار کو مکمل

چھٹی ہوتی ہے، بے اختیار اس کا منہ چومنے کو جی چاہا۔ جین نیاز میں تشکر کے سجدے ٹپنے

لگے اور اللہ تعالیٰ کی بیکراں نعمتوں میں سے اتوار کی تعطیل کا خصوصیت سے احساس ہونے

لگا۔ اتوار کا انتظار ہم سے زیادہ کسی نے نہ کیا ہوگا۔ اب ہماری تمام تردعائیں پھیٹیوں اور بارش کے

لیے وقف ہو گئیں اور لفیٹنی کی عنایت کے لیے ہم نے اللہ تعالیٰ کو کبھی مزید رحمت نہ دی۔

الغرض لفیٹنی کا وہ حسین و جمیل قصر جسے ہم نے تصورات کے موقلم سے بنایا اور

سجایا تھا، پہلے روز ہی منہدم ہو گیا اور یہ ابھی ابتداء تھی جو کچھ آگے ہوا، اس کی روداد طویل

بھی ہے اور جانگسل بھی۔ مختصر یہ کہ پہلی ڈرل میں پاؤں نگا رہوئے تھے۔ چند روز میں اٹفل

ہلی تو سلوپ (SLOPE) کرتے کرتے ہاتھ بھی خونچکاں ہو گئے۔ رائل پر سنگین کا اضافہ

ہوا اور مصنوعی دشمن کو مارنے کی مشق کرانی جانے لگی، تو تقریباً خودکشی ہو کر رہ گئی۔ میلوں

بے آب و دانہ مگر با پھو مارچ کیا۔ حتیٰ کہ ان کا فر بوٹوں کے دل بھی موم ہو گئے، لیکن کسی

○ پٹھو ساز دسامان کا وہ وزنی تھیلہ ہے جو مارچ کرتے وقت پشت پر اٹھایا جاتا ہے۔

سارجنٹ کو رقت نہ ہوئی۔ مسلسل کھدائی سے ارضِ مہو کا سینہ شق ہو گیا، لیکن کمپنی کمانڈر کا دل نہ بگھلا۔ کمانڈنٹ صاحب نے ہمارے کھودے ہوئے مورچوں کے ہر خط اور زاویے کا جائزہ لیا، لیکن ہمارے زخم جگر کی خبر نہ لی۔ نیچ روڈ کے چپے چپے پر ہم نے رنجور قدموں کے نقوش چھوڑے۔ ہیا پاڑی کے ہر سنگریزے پر ہم نے آبلے چھوڑے۔ ہماری ہر صبح جو بی گھوڑے پر سے کودنے اور رستے پر چڑھنے میں صرف ہوئی اور ہماری ہر شام بے مرج اور بد ذائقہ انگریزی ڈز کی وجہ سے حرام ہو گئی۔ ایکسٹرا ڈرل سے بچنے کے لیے ہسپتال میں داخل ہونے کی بارہا کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ دیسی کھانے کے لیے باورچی کی ہزار منتیں کیں لیکن بد بخت سارجنٹ کے ڈر سے راضی نہ ہوا۔ جی چاہتا کہ اگر سارجنٹ کو نہیں تو کم از کم باورچی ہی کو قتل کر ڈالیں، لیکن اگر اس کی ہمت بھی ہوتی، تو فرصت کہاں تھی؟ اور آخر ایک روز فرصت ملی، تو معلوم ہوا کہ لفٹین ہو گئے ہیں!

لیکن یہ لفٹینی ہم پر دوسرے جھے ہی نازل نہیں ہو گئی تھی، بلکہ اس کی پیدائش کے لیے ہمیں بے چاری زگس کی طرح پورے نو مہینے اپنی بے نوری پر رونا پڑا۔ چنانچہ ہم ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدور پیدا

○ ہو کے نواح میں ایک سڑک ہے جس پر اکثر مارچ کیا جاتا تھا۔

● ہیا ایک مشہور پاڑی کا نام ہے جو ہوسے چند میل دور ہے اور جہاں اکثر فوجی

مشقیں کی جاتی تھیں۔

نزولِ لفظی

ٹرننگ کا چھٹا مہینہ تھا کہ سگنل کی تربیت کے لیے دس کیڈٹوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب امیدواروں کو ایک علیحدہ ادارے یعنی سگنل ٹرننگ سنٹر میں جانا تھا۔ شاید یہ ایکسٹرا ڈرل کا خوف تھا کہ ہر کیڈٹ نے اوٹی ایس سے جان چھڑانے کے لیے عرضی دے دی، کیونکہ اُڑتی سی خبر تھی کہ سگنل ٹرننگ سنٹر میں کیڈٹ بھی انسانوں میں شمار ہوتا ہے اور جب ہمارا نام دس منتخب کیڈٹوں کی فہرست میں آگیا تو باقی کیڈٹ ہمیں اس طرح مبارکباد دینے آئے جیسے جشنِ استقلال کی خوشی میں قبل از وقت رہا ہونے والوں کو پس ماندہ قیدی رخصت کرتے ہیں۔

سگنل ٹرننگ سنٹر بھی مہو میں تھا اور اوٹی ایس سے بہت دُور نہ تھا۔ جس روز ہم اوٹی ایس سے رخصت ہوئے ہمارے ذمے دو چار ایکسٹرا ڈرل باقی تھیں اور ہمیں خوف تھا کہ کہیں سگنل سنٹر میں پہنچنے کے بعد بھی اوٹی ایس والے اس اُدھار کی ادائیگی کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔ اتفاق سے دو دن بعد اوٹی ایس کا سارجنٹ میجر سگنل سنٹر میں آنکلا اور ہمارا تھا ٹھنکا کہ ہونہ ہو یہ ایکسٹرا ڈرل کا حساب چکانے آیا ہے، لیکن جب اُس نے عام انسانوں کی طرح ہم سے ہاتھ ملایا اور اسی طرح مسکرانے بھی لگا جس طرح ہم آپ مسکراتے ہیں، تو باور نہ

آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ کیڈٹ خدا کی اسفل ترین مخلوق ہے، لیکن ابھی ہمارے لیے آخری حیرت باقی تھی۔ جب پیارِ محبت کی باتوں کے بعد ہم سے رخصت ہونے لگا، تو ہمیں سرکہہ کر خطاب کیا، پھرتی سے سیوٹ کیا اور جانے کی باقاعدہ اجازت مانگی۔ یہ واقعات ہمارے لیے اس قدر غیر متوقع تھے کہ اگر اسی لمحے کوئی شہزادی ہمارے گلے میں ہار ڈال کر ہمیں خاوند منتخب کر لیتی تو ہمیں بالکل تعجب نہ ہوتا اور ہم بلا تکلف و بیعہدی شروع کر دیتے۔

بگنل سنٹر میں پہنچے تو وہ جو احترامِ انسانیت کی افواہیں تھیں، سچ مچ درست نظر آنے لگیں۔ تمام اُستاد ادب سے پیش آئے، لیکن چھ ماہ کی متواتر بے ادبی کے بعد، ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھی قابلِ ادب قسم کے آدمی ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری تعظیم ہمیں جعلی سی لگتی تھی۔ ہماری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی جیسی نظام ستے کی اپنی مختصر سی جلالت مآبی کے دور میں ہوتی ہوگی۔ شاید ہماری حالت زار نظام سے بھی کچھ پتلی تھی، کیونکہ اُسے اپنا انجام معلوم تھا اور ہمیں اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ فالو احترامِ واقعی کوئی دیر پا چیز ہے یا کسی وقت یہی مؤذّب انٹرکٹراٹک ہلاکوانہ قہقہہ لگا کر ہمیں ثریا سے کھینچ کر زمین پر دے ماریں گے اور پھر ہم ہوں گے اور ایکسٹرا ڈرل؛ لیکن رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ اس احترام میں تلاوٹ نہ تھی اور یہ کہ ہمیں مرتبے کا احساس قصداً دلایا جا رہا تھا۔ وہی احساس جو اوٹی ایس میں ہمارے دماغ سے نچوڑ لیا گیا تھا۔ اُس وقت کہ ہم تازہ تازہ شہری زندگی سے فوج میں آئے تھے وہی صحیح تھا اور اب کہ افسری کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ہمیں افسرانہ انداز سکھائے جا رہے تھے۔

لیکن ہم اپنے اُستادوں کی نسبت اپنے انگریز ہم جماعتوں سے وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو زندگی بھر نہ سیکھا تھا۔ جماعت میں ہم بیس کیڈٹ تھے، دس دیسی اور دس انگریزی یہ

انگریز ہندوستان میں انگریزی فرموں کے ملازم تھے اور جبری بھرتی کے قانون کے تحت تربیت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ یوں تو ہم سب برابر تھے، لیکن جماعت میں ان انگریز طلباء کا کاروبار ہم دسیوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ جماعت میں اُستادوں کے ساتھ یوں ہمکلام ہوتے، جیسے چائے پیتے ہوئے دوستوں کے ساتھ گفتگو کر رہے ہوں۔ ادب ضرور کرتے لیکن خوف نہ کھاتے۔ ان سے کوئی انٹرکٹرسوال پوچھتا تو جواب دینے سے پہلے آرام سے پائپ کاکش لگاتے، پھر اُسے ڈیک پر رکھتے اور پھر کرسی پر ذرا نیم دراز ہو کر جواب دیتے اور اس انداز سے کہ اگر درست ہے تو خیر، اگر نہیں بھی تو کوئی حرج نہیں کہ یہی ہمارا نقطہ نگاہ ہے۔

برخلاف اس کے ہم دسیوں کے دل میں ہر وقت چورسا رہتا۔ جواب آتا تو جواب دینے میں بیٹابی۔ اگر نہ آتا تو احساسِ جرم اور چھپنے کی کوشش۔ اُن لوگوں کی خود اعتمادی اور پختگی اُن کے کردار کا حصہ تھی اور یہ غالباً اُن کی ابتدائی تعلیم کا فیض تھا۔ ہمارا احساسِ کمتری ہماری اپنی ابتدائی تعلیم کا عطیہ تھا۔ وہی تعلیم جس میں شاگردوں کو مُرغابانا اُستاد کی بہترین

TEACHING AID یعنی درسی امداد ہے — یہ کہنا بجا ہے کہ ہمارے لیے نئی چیزیں سیکھنا اتنا ضروری نہ تھا جتنا پرانی عادتیں بھلا دینا۔ اور ہم میں سے وہ جو ایسا نہ کر سکے، سینئر عہدوں پر پہنچ کر بھی نابالغ ہی رہے۔ یہ نہیں کہ انگریزوں میں نالائق یا نکتے نہیں ہوتے۔

کئی ایک کا ذکر آگے آئے گا بھی۔ نکتہ یہ ہے کہ صرف ذہین ہونا ہی کافی نہیں، کچھ شخصیت ہونا چاہیے، کچھ کردار ہونا چاہیے اور وہ جو اقبال نے کہا ہے کچھ محفل میں بات کرنے کا شعور ہونا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ ان معاملات میں ہم ان انگریز دوستوں کو بتائے بغیر اُن کی شاگردی کر رہے تھے اور مُرغابنے بغیر وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو مکتب کی خاکبازی میں نہ سیکھ پائے تھے۔

ذکرِ سگنل سنٹر کی زندگی کا تھا۔ اس زندگی میں آسائش تھی لیکن خدا جانے کیا وجہ تھی کہ وہ لطف نہ آ رہا تھا جو درستی اور مشقت کے باوجود اوٹی ایس کی زندگی میں تھا۔ جب

اس مسئلے کو اندر سے جھانک کر دیکھا تو ہم پر روشن ہوا کہ درستی اور مشقت ہی تو لطف کا منبع تھے ع

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کب

لیکن سگنل سنٹر کی زندگی فقط اللہ ہو کے گرد ہی نہیں گھومتی تھی۔ جہاں ارجن سنگھ ایسے ہم جماعت ہوں وہاں کئی ایسے واقعات ناگزیر تھے جو دل زرداں میں بھی کھٹکنے لگیں۔ ارجن سنگھ ایک قومی سیکل اور خوش مزاج سیکھ کیڈٹ تھا۔ پنیاس کی کمزوری تھی۔ ایک شام ارجن سنگھ کو معمول سے زیادہ بدست پایا گیا۔ حالانکہ اُس روز میس میں ارجن سنگھ نے شراب کو چھوٹا تک نہ تھا۔ دوسرے روز کلاس میں بھی ارجن سنگھ معمول سے زیادہ موج میں تھا اور کلاس کے رستے میں کوئی میخانہ بھی نہ پڑتا تھا۔ ہمارے ایک انگریز ساتھی مارٹن نے شرارتاً کہہ دیا کہ ارجن سنگھ نمبو پانی پر ہی ٹائٹ ہو گیا ہے۔ ارجن سنگھ اس تہمت پر بزرگانہ انداز میں مسکرا دیا۔ شام ہوئی تو ارجن سنگھ کی مستی عروج پر تھی۔ دفعۃً اپنے کمرے سے نکلنا اور ایک دوسرے کیڈٹ کی کمر میں بازو ڈال کر ناچنے لگا۔ معمایہ تھا کہ ارجن سنگھ آفر کیا پی رہا ہے جو دو روز سے ہوش میں نہیں آتا؛ رقص جاری تھا کہ ہمارے کمان افسر یعنی کرنل صاحب ادھر آئے۔ دراصل وہ بھی ارجن سنگھ کی مستی کا عقدہ حل کرنے کی فکر میں تھے۔ ارجن سنگھ نے انہیں دیکھا تو اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں، بڑھا اور کرنل صاحب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنے کی ابتدا کرنے لگا، لیکن کرنل صاحب نے مسکرا کر کہا:

”ارجن سنگھ، ناچیں گے بعد میں، آؤ ذرا تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“

ارجن سنگھ بخوشی راضی ہو گیا۔ بدستور کرنل صاحب کی کمر میں بازو ڈالے انہیں کمرے میں لے گیا اور حسب دستور پوچھا کہ کچھ پیئیں گے؟ کرنل صاحب یہی تو معلوم کرنا چاہتے تھے؛ چنانچہ انگریزوں کا وہ روایتی فقرہ بولے: ”I WOULD LOVE IT“ اس پر ارجن سنگھ

اٹھا، اپنا پلنگ اٹایا۔ نیچے دو کنتر دسی شراب کے پڑے تھے۔ ارجن سنگھ نے ایک پر سے ڈھکنا اٹھایا اور ایک لمبا گلاس بالب بھر کر کرنل صاحب کو پیش کیا۔ کرنل صاحب ذرا جھجکے تو ارجن سنگھ بولا:

”چھک جاؤ موتیاں والیو۔ آہ و سکی اے۔ آپاں گھر بناونے ہاں۔“

کرنل صاحب کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا؛ البتہ انہوں نے ارجن سنگھ کی خوشنودی کے لیے گلاس منہ سے لگایا۔ خدا جانے ارجن سنگھ کی خانہ ساز میں کیا تاثیر تھی کہ کرنل صاحب ایک دفعہ گلاس کو ہونٹوں سے لگانے کے بعد جڈانہ کر سکے اور پورا گلاس حلق میں اُنڈیل لیا۔ راوی یعنی ارجن سنگھ کے بیرے کا کنا ہے کہ کرنل صاحب نے دوسرا گلاس اپنے ہاتھوں سے بھرا اور چڑھا گئے۔ کوئی آدھا گھنٹہ بعد جو نظارہ ہم باہر کھڑے ہوئے تماشا میوں نے دیکھا یہ تھا: کیڈٹ ارجن سنگھ اور کرنل صاحب اپنے ہاتھوں میں جام شراب تھامے اور بازو ایک دوسرے کے گلے میں جمائے کیے تھرکتے تھرکتے کمرے سے باہر آتے ہیں اور ہم سے قطع نظر کیے ہوئے چل نکلتے ہیں۔ اگر کسی سے ذرا آنکھ لڑ جاتی ہے تو نہایت چابکدستی سے جوابی آنکھ مارتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ ارجن سنگھ کا بیرا سر پر کنتر اٹھائے اُن کے پیچھے پیچھے رواں ہے۔ بیرے سے پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کنتر کی منزل کرنل صاحب کا بنگلہ ہے۔

یہ سنگل سنٹر کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔ کام کی بھی کمی نہ تھی؛ تاہم ظاہر تھا کہ اس ماحول میں وہ اوٹی ایس کے دنوں کے خود کشی کے منصوبے قطعاً بے جا ہیں، بلکہ یہاں کچھ اس تیزی سے دن کٹے کہ ایک دن لفیٹنی کا حکم آگیا اور آنا فانا ہمارے شانے پھولوں سے جگمگا اٹھے۔ اگرچہ ان کی تعداد بالفعل ایک پھول فی شانہ ہی تھی۔

اب ہمیں آنے والی زندگی سے عجیب کیف محسوس ہو رہا تھا۔ کورس کے خاتمے سے

چند روز پیشتر پوسٹنگ کے سلسلے میں ہم سے اپنے مرغوب ٹیشن پوچھے گئے۔ ہمارا انتخاب بالترتیب لاہور اور پشاور تھا۔ لاہور آنے کا ہمیں خاص شوق تھا کہ جس دیار کے کوچوں کی ہم نے ایک گنام طالب علم کی حیثیت سے خاک چھانی تھی، اب اسی خاک کو افرانہ شان سے روندنا چاہتے تھے۔ جب پوسٹنگ کا حکم شائع ہوا تو ہمارا تقرر پشاور ڈسٹرکٹ بنگلہ میں ہوا۔ لاہور نہ ملنے پر مایوسی تو ہوئی، لیکن قابل برداشت سی۔ پشاور کی ایک خوبی تو ظاہر تھی کہ ہمارے لیے نئی جگہ تھی۔ علاوہ ازیں جب اپنے پٹھان دوستوں سے پشاور چھاؤنی کی دلچسپیوں اور پشاور کلب کی رنگینیوں کے چرچے سنے تو نہایت بیٹابی سے سخت سفر باندھا۔

نیم لفظین پشاور میں

اپریل ۱۹۴۱ء کی وہ صبح بھولنے کی نہیں، جب وہ چھوٹی ریل گاڑی ہم نیم لفظینوں کی ہنستی گاتی ٹولی کو لیے مہو کے سٹیشن سے نکلی۔ معنا ہمیں وہ دن یاد آیا جب نومبر پندرہم اسی سٹیشن پر پہلی مرتبہ اترے تھے اور گورے سار جنٹوں نے ہمارے پندار کی گڑبہ کاروز اول ہی کام تمام کر دیا تھا، لیکن وہی گورے آج ہمیں سیٹوٹوں سے رخصت کر رہے تھے۔ ہمارا مورال اس بلندی پر کبھی نہ پہنچا تھا۔ اب ہمیں کسی سے گلہ تھا نہ شکوہ۔ دنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی۔ جتنے کہ مہو کے وہ مصافحات بھی چلتی گاڑی سے دلفریب نظر آ رہے تھے جن سے چند منٹ کی قسم کی فوجی مشقوں کی یاد دابستہ تھی۔ ہتیا پہاڑی تو ہمیں وادی گنگا کی طرح محبت کے اشارے کر رہی تھی۔

درازی سفر میں ہم نے افسرانہ مستقبل کے لیے جو منصوبے بنائے وہ زیادہ تر بیس، کلب، برج، سواری اور یونیفارم وغیرہ کے متعلق تھے۔ یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ عین اُس وقت ایک عالمگیر جنگ بھی جاری تھی جو ہمارے وطن تک اگرچہ نہیں پہنچی تھی؛ تاہم ہمارے ہزاروں ہم وطن اس تک پہنچ چکے تھے اور کئی سردھڑکی بازی بھی لگا چکے تھے اور یہ کہ خود ہمیں

MORALE جوصلے اور خود اعتمادی کے لیے فوج کا ہیکہ بند لفظ

بھی کچھ اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا، لیکن فی الحال ہم لڑائی سے مختلف سمت میں جا رہے تھے اور جنگ کا خیال قطعاً بے با تھا؛ البتہ ہمارے ایک پشاور سے ساتھی محاذ جنگ پر نہ بھیجے جانے کی وجہ سے خاصے افسر وہ تھے، بلکہ ٹرننگ کے دنوں میں ہی جب ایک دن کسی مضمون میں فیل ہونے پر ان سے باز پرس ہوئی، تو انہوں نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا:

”ہم فیل میل کچھ نہیں جانتا۔ ہم بنیا نہیں جو سوال نکالے۔ ہم کو لڑائی میں بھیجو، ہم بادشاہ کی خدمت کرنے آیا ہے۔“

دراصل ہمارے دوست کو تکلیف یہ تھی کہ ان کے گھر میں ایک ڈھال اور ایک تلوار رکھی تھی اور یہ تاریخی اسلحہ ان کی خاندان کی روایات کے مطابق بانی خاندان کے استعمال میں آیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا تعین نہیں ہو سکا تھا کہ یہ واقعہ سکندر کے حملے سے پہلے ظہور میں آیا تھا یا بعد میں لیکن بہر حال یہ اس امر کی صریح علامت تھی کہ آپ ایک مارشل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چنانچہ آبائی سپہ گری کے اس تابناک پس منظر میں آپ کو یہی صورت گوارا نہ تھا کہ حسن اتفاق سے جنگ جاری ہو یعنی خدانے ان کے لیے دادِ شجاعت دینے کے تمام اسباب پیدا کر رکھے ہوں، اور وہ راولپنڈی جیسے دارالامان کو بھیج دیے جائیں۔ چنانچہ تمام راستے ان کا مارشل خون کھولتا رہا اور ہم سے الگ غصے میں WARLIKE STORE بنے بیٹھے رہے۔

ہو سے پشاور تک سب ساتھی درمیانی سٹیشنوں پر اتر گئے اور گاڑی سر شام

پشاور پہنچی۔ ہمارے استقبال کے لیے دو افسر موجود تھے۔ دونوں انگریز۔ ان دنوں دیسی افسر ابھی گنتی کے تھے۔ دیسی افسروں کی تھوک بھرتی کسی قدر بعد میں شروع ہوئی۔ جب جاپان نے جنگ میں کود کر آگ سی لگادی اور وہی لفٹینی جو ہم نے خون جگر سے حاصل کی تھی، سر راہ بٹنے لگی۔ اب استقبال کو تو یہ دو انگریز آگئے تھے، لیکن ان کا طرزِ تپاک

○ سامان جنگ کے لیے فوجی اصطلاح

کچھ ایسا تھا جسے دیکھ کر دل جل تو نہ گیا، لیکن مجلس ضرور گیا۔ پھپکی سی مزاج پُرسی اور بس — پھر
کار میں بٹھا کر ہمیں خارج از بحث سمجھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ گویا پھلی سیٹ پر انسان نہیں،
بستر رکھا ہے۔

سگنل آفیسر میس میں پہنچے، تو ہمیں اپنا کوارٹر دکھایا گیا۔ ایک اُمیدوار بیرا شیر باز
پہلے ہی سے انتظار میں بیٹھا تھا کہ آنے والا صاحب بے بیرا ہو تو شاملِ خدمت ہو جائے۔
ایسا ہی ہوا، وقت کم تھا ہم نے ڈنر کے لیے کپڑے بدلے۔ چونکہ میس میں جانے کے لیے
پہلی شب کا معاملہ تھا، اپنی ”ٹرن آؤٹ“ کی نوک پلک خاص طور پر سنواری اور اس سلسلہ میں
شیر باز کے ماہرانہ مشوروں سے استفاد کیا کہ وہ مقامی رسوم سے باخبر تھا اور سالہا سال کی بیرا توپ
کے طفیل ان معاملات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔

میس میں پہنچے، تو معلوم ہوا کہ بتیابی میں سب سے پہلے آگئے ہیں۔ انٹی روم کے
زیبائشی سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ پاس ریڈیو پڑا تھا۔ ایک سگنل افسر کو کہیں ریڈیو نظر آجائے،
تو بقول شخصے اُسے چھیڑنے کا پہنگا ضرور لیتا ہے۔ ہم نے بھی لیا۔ سوئی اتفاقاً لاہور کے ٹیشن
پر جاز کی جہاں سے کوئی غیرتِ ناہید ڈھولک کا گیت گارہی تھی ”ٹاہلی دے تھلے بہر کے“
ہم اس کے شعلے کی لپک میں آگئے اور میس و ماہیما سے غافل ہو کر پاس کے صوفے پر بیٹھ کر
سُسنے لگے تا آنکہ باہر سے بیک وقت دوچار انگریزی آوازیں بلند ہوئیں اور متفقہ طور پر اس
گٹاخ کے نام اور سر کا مطالبہ کیا جو یہ و خیانہ موسیقی سُسنے کا ارتکاب کر رہا تھا۔

یہ چند انگریز افسر تھے جو ابھی میس کے بیرونی دروازے تک ہی پہنچے تھے اور اس
انگریز کدے میں دیسی گانا ایک باغیانہ فعل سمجھتے تھے۔ وہ ابھی باہر ہی شور مچا رہے تھے میں

○ یہ لفظ بیرا کا پشتو ماصل مصدر ہے۔

● پنجابی لفظ ہے مطلب ہے خواہ مخواہ وہ کام کرنا جو نقصان کا باعث ہو۔

نے سوچا کہ یونٹ میں پہلا دن ہے۔ اپنے متعلق اولین تاثرات فراہم کرنا قرین مصلحت نہیں لہذا ریڈیو بند کر دینا چاہیے، لیکن کسی اندرونی آواز نے مشورہ دیا کہ ریڈیو بند کر کے تم ان کی خوشنودی تو شاید حاصل کر سکو گے یا نہیں؛ البتہ اپنی بزدلی کا خاصا پختہ ثبوت دو گے۔ چنانچہ ریڈیو کو لگا رہنے دیا، لیکن اب سحر موسیقی کی وجہ سے نہیں، بلکہ تحفظ ناموس کی خاطر۔

انگریز افسروں کا خیال تھا کہ کسی نوکر نے میس خالی دیکھ کر گانا لگا رکھا ہے لیکن جب اندر داخل ہوئے اور مجھے ریڈیو کے پاس بیٹھے دیکھا تو سمجھے کہ سچ مچ غدر کی ابتداء ہو رہی ہے۔ ذرا رُکے اور پھر ان میں جو ایمپائر کا سب سے بڑا فدائی تھا، بڑھا اور مجھ سے کہنے لگا:

”خبریں نہ سنو گے؟“ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سوئی گھا کر بی بی سی پر کر دی اتفاق سے اس وقت خبریں بھی شروع تھیں؛ چنانچہ میں خاموش رہا۔

میں اس میس میں نو وارد تھا، لیکن کسی نے مجھ سے مصافحہ تک نہ کیا۔ ظاہر تھا کہ نادانستہ سی، لیکن قصور ہم نے معرکے کا کیا ہے، جسے انگریزوں کی آئندہ نسلیں بھی معاف نہ کریں گی۔ بعد میں دوسرے افسر آئے۔ وہ بھی انگریز تھے، لیکن انہیں ہماری بغاوت کا علم نہ تھا۔ ان میں سے ایک جوٹیشن سے ہمیں ساتھ لایا تھا اور ایڈجوٹنٹ تھا، ہمارے صوفے پر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ میں نے میس اور اس کی آرائش کی تعریف کی۔ اتفاق سے سامنے ایک عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ میں نے پوچھا:

”یہ عورت کون ہے؟“

میرا یہ کہنا تھا کہ ایڈجوٹنٹ صاحب کا رنگ بدل گیا اور مجھے ایک حیرت، ایک قمر کے عالم میں گھورتے ہوئے بولے:

”عورت؟ خدا کے بندے یہ محض عورت نہیں، پرنس رائل ہے؛ تمہاری سگنل کور کی کرنل کمانڈانٹ؛ تم واقعی سگنل، ہو؟“

اب یہ واقعہ ہے کہ مجھے شہزادی موصوف کے کرنل کمانڈانٹ ہونے کا علم اور محض ضرور
 تھا، لیکن یہ کہ سامنے والی تصویر ان ہی کی ہے اس کا مجھے علم نہ تھا۔ ایسے حالات میں انگریزوں
 میں معذرت کا ایک معروف فقرہ دہرایا جاتا ہے اور سارا گلہ دھل جاتا ہے۔ ہم نے بھی یہی عمل
 کیا، لیکن گلہ دھلنا تو کجا، اس انگریز کے چہرے پر سیم اور تھور کی نوع کی علامات پیدا ہونے
 لگیں اور ان آثار کے زائل کرنے کا طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ناچار چپ ہو کر بیٹھ گیا۔
 ہمارے لیے یونٹ کی ابتدا یقیناً اچھی نہیں ہوئی تھی، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا دل
 کو سمجھایا کہ دیکھو میاں! اس ملک میں جب تک ہمارا واسطہ انگریزی اونیٹ سے ہے،
 کوہان تو ہو گا۔ باقی رہیں میس کی پہلی رات کی وارداتیں، تو ان سے پریشان ہونا لفٹین کی
 شان نہیں۔ میس کے باہر بھی بیسیوں کام ہیں ان میں قابلیت کا سکہ بٹھایا جاسکتا ہے اور ٹوٹے
 ہوئے دل بڑھی سکتے ہیں۔ ویسے اس شب کھانے کے دوران ان کے جڑنے کا
 کوئی امکان نظر نہ آیا، بلکہ ایک پلیٹ ہمارے ہاتھ سے ٹوٹے ٹوٹے بچی۔ یوں معلوم ہوتا تھا
 جیسے ریڈیو، تصویروں، پلیٹوں غرض ہر چیز نے ہمارے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ فقط ایک
 شخص جو بائیں جانب میز پر بیٹھا تھا، ہم سے کسی قدر گرمجوشی سے باتیں کرتا رہا۔ وہ ولایت سے
 تازہ تازہ آیا تھا اور ایک دیسی کانگریز کی خاطر لڑنا احسان سمجھتا تھا۔ یہ لفٹنٹ وائٹ تھا۔ جان
 وائٹ کی ملاقات اس شب کے ناگوار حادثوں کے بعد منہ میں گویا میٹھا ذائقہ چھوڑ گئی۔
 دوسرے دن کمان افسر سے ملاقات ہوئی۔ خیال تمہارات کی لغزشوں کی صفائی طلب
 کریں گے، لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ایڈجوٹنٹ صاحب نے البتہ اعلان
 جنگ واپس نہیں لیا تھا۔ دانت پپس پپس کر ہمیں اپنے نئے فرائض کے متعلق حکم سنایا اور
 نتیجتاً ہم ایک ایسے سیکشن کے افسر یا فوجی زبان میں اوسی (O. C.) مقرر ہوئے جس کا کام
 پہاڑی توپ خانے کو موصلات ہم پہنچانا تھا۔

اس سیکشن میں انسان تھوڑے تھے اور گھوڑے اور خچر زیادہ۔ طبیعت پہلے تو کچھ برہم ہوئی، لیکن جب میں اپنے سیکشن میں پہنچا اور ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تو ایمان تازہ ہو گیا۔ یہ سیکشن تمام تر پنجابی مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یہ سن کر کہ ایک دیسی افسر پہلی دفعہ اسی مقرر ہوا ہے، ان لوگوں نے اس خلوص سے میرا خیر مقدم کیا کہ میں انگریزوں کی رنجش بھول گیا۔ سینئر عہدیداروں نے نہایت شوق سے مجھے سیکشن کا سامان دکھایا اور جوانوں کے علاوہ تمام گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ جی ہاں! ان سب کے اپنے نام تھے، اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی شخصیتیں! اس پہلی ملاقات پر سیکشن کے لوگ جس محبت کا اظہار کر رہے تھے، وہ خود اس سے کہیں زیادہ محبت کیے جانے کے قابل تھے اور میرے دل میں یہ عہد مستحکم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی توقعات کو کبھی تشنہ نہ رہنے دوں گا۔

اُس شام جب میں میس میں گیا تو انگریز اگرچہ بدستور کچھ کھچے سے تھے، لیکن میرے دل میں ایک ایسا اطمینان تھا جسے انگریزوں کی ناراضگی نہیں چھین سکتی تھی اور ہمارا مقاطعہ ایسا مکمل بھی نہ تھا۔ جان واٹس ہم سے غیر معمولی تپاک سے بھنگیر ہوئے اور ریڈیو کی طرف اشارہ کر کے بولے: "ذرا اپنے ملک کا گانا تو سناؤ۔" پھر ہنس کر بتایا کہ آج دن بھر تمہارے پنجابی گانا سننے اور پرنس رائٹ کی تصویر کو نہ پہچاننے کے متعلق بحث ہوتی رہی۔ سارجنٹ لوگوں نے تو تمہارے خلاف کمان افسر تک شکایت پہنچادی، لیکن اٹلی ان کو تہیہ ہوئی۔ میں نے پوچھا: "سارجنٹ لوگ کون ہے؟ تو کہنے لگا: "یہی تم سے لڑنے والے افسر۔ یہ سب پہلے سارجنٹ تھے، اور اگر لڑائی نہ چھڑتی، تو اس وقت بھی سارجنٹ ہی ہوتے۔" بہر کیف ہم نے کسی قدر فاتحانہ انداز سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ انتقامی جذبے پر قابو پا کر ریڈیو کو تونہ پھیڑا، لیکن جان واٹس کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر منہ سے ماہیے کی ایک کلی گنگنادی اور جان نے اپنی تحسین کے اظہار کے لیے والہانہ تالی بجادی۔

وائٹ سے اب ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ دوسرے انگریزوں سے بھی ہمیں تو کچھ
 بیرنہ تھا؛ البتہ وہ ذرا خا سے تھے اور وائٹ کی حرکتیں اس خفگی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔
 وائٹ دراصل ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان تھا۔ کیمبرج سے تعلیم اُدھوی
 چھوڑ کر آیا تھا۔ اُسے اپنے تلفظ کا خاص طور پر خیال تھا اور باقی انگریزوں سے نہایت
 اہتمام سے نفرت کا اظہار کرتا تھا، کیونکہ اُن کی زبان اور تلفظ گرامر کی پابندیوں سے بے نیاز
 تھے۔ ان کے پاس فقط دس بارہ فحش مگر چہت اور جامع سے الفاظ تھے جن سے وہ اپنا تمام تر
 مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ یہ الفاظ کسی ڈکشنری میں نہیں ہوتے، یہ صرف سارجنٹ لوگوں
 کے یہاں سینہ بہ سینہ چلا کرتے ہیں۔ وائٹ کی اپنی زبان بیشک کلچر کی آئینہ دار تھی، لیکن جو
 چٹھارا سارجنٹوں کی مرصع زبان میں تھا، اُس سے بھی انکار مشکل ہے۔

یونٹ میں کوئی پندرہ دن گزرے تھے کہ اچانک ہمارے کمان افسر کا تبادلہ ہو گیا
 اُن کا جانا تھا کہ ہمیں ایڈیوٹنٹ نے طلب کیا اور حکم دیا:

”تم آج اٹھارہ سو بجے (یعنی شام چھ بجے) کی گاڑی سے بنوں جاؤ گے اور وہاں
 سے آگے ٹوچی کالم میں جا کر شامل ہو گے جو اس وقت فقیر اپنی کے خلاف وزیرستان میں
 دناخیل کے مقام پر مصروف جنگ ہے۔ وہاں تم لفٹنٹ ٹام کو فارغ کرو گے۔“
 جب وائٹ کو ہمارے تبادلے کا علم ہوا تو بھاگا بھاگا آیا اور بولا:

”یہ ٹام بھی سارجنٹ ہے۔ اس کے نہ ہونے سے ان لوگوں کی برج کی چوکڑی
 ناممکن تھی۔ صرف کمان افسر کے کہنے پر ہمیں یہاں رکھا گیا تھا، ورنہ پہلے ہی دن فقیر اپنی
 کی خدمت میں بھیج دیے جاتے۔“

اٹھارہ سو بجے ہم بنوں جانے والی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ فرنٹیئر کی لڑائیوں میں
 بیرا ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے؛ چنانچہ شیراز ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اس سے

پہلے بھی اپنے کئی انگریز صاحبوں کے ساتھ سرحدی معرکوں میں شریک ہو چکا تھا عام لوگوں کو علم نہیں کہ ان سرحدی لڑائیوں میں بھی دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ شیربازے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کا ایک انگریز صاحب قبائلیوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا شناختی کارڈ اور دوکان واپس ملے تھے۔ ہمارے اطمینان کے لیے شیربازے نے اتنا اضافہ کیا کہ ”تم فکر مت کرو، وہ مسلمان کالا شہ خراب نہیں کرتے۔“

ادھر سیٹی بجی اور گاڑی بنوں کو روانہ ہوئی۔

کوہستان جنگ

بیرے شیرباز نے ہمیں انگریزوں کے مقابلے میں رعایت تو کافی دی تھی کہ مرنے کے بعد ہمارے کانوں کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی، لیکن قبائلیوں کی اس اسلامی دوا داری کے باوجود ہمیں زندہ رہنا کچھ بہتر ہی معلوم ہوتا تھا۔ یوں بھی ہمیں ایک انگریز کو برج کے لیے فارغ کرنے کو بھیجا جا رہا تھا۔ کوئی شہادت کا معاملہ تو تھا نہیں کہ ہم گاڑی میں داخل ہوتے ہی سرکبف ہو جاتے؛ چنانچہ بالکل عام آدمیوں کی طرح سفر کیا۔ عام آدمیوں کی طرح بھیجنے والوں کو کوسا اور رات کو وہی متوقع خواب دیکھے کہ کان غائب ہیں۔

دوسرے روز بنوں ٹرانزٹ کیمپ میں پہنچے۔ منزل مقصود تو میرا شاہ سے آگے دتا خیل تھی جہاں ہمارا برگائیڈ (ٹوپی کالم) فقیر اپنی سے لڑنے کے لیے بڑھ رہا تھا، لیکن بنوں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آگے جانے کے لیے R.O.D. یعنی سڑک کھلنے کے دن کا انتظار کرنا پڑے گا جو ہفتے میں ایک ادھ مرتبہ آتا تھا۔ اس وقفے میں شیرباز کو اتفاقاً علم ہو گیا کہ ہمیں چالاکا کی سے ٹام کی جگہ بھیجا جا رہا ہے۔ شیرباز اس پر بہت برہم ہوا۔ مجھے پشتو نہیں آتی تھی، لیکن ٹام کے حق میں جو خارداری پشتو اس کے منہ سے نکلی، ظاہر تھا کہ قصیدے کی قسم کی چیز نہیں؛ البتہ اردو میں

ROAD OPEN DAY ○

شیرباز نے ہمیں اتنا کہا کہ ”صاحب آپ کے ساتھ ٹنگی (ٹھگی) ہو گیا ہے، ہم اس کا علاج کرے گا اور تم کو واپس پنجاور بھیجے گا۔“ (پشاور بھیجے گا)

یہ تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ شیرباز فوجی احکام میں ترمیم کیسے کرائے گا، لیکن شام کے کھانے کے لیے میس کو جانے لگا، تو شیرباز ایک تیکے کبابوں سے لبریز پیٹ لے کر آ نکلا۔ کسی انگریزی میس کے رستے میں ایک دیسی افسر کے لیے تیکے کبابوں سے بہتر کوئی روڈ بلاک نہیں؛ چنانچہ اس رات ہم میس سے غیر حاضر رہے۔ اس کے بعد شیرباز نے ہر کھانے سے پہلے تیکے کباب کھلانے کا معمول بنا لیا۔ اسی طرح ہفتہ گزر گیا اور سڑک کھلنے کا دن آ گیا۔ صبح کا نوائے جانا تھا۔ رات شیرباز آیا، تو میں نے کہا:

”شیرباز، وہ پنجاور کی واپسی کیا ہوئی؟“

شیرباز کسی قدر جھنجھلا کر بولا:

”ہم نے تم کو اتنا تیکا کباب کھلایا (کھلایا)، خوہ تم نا جوڑ ہی نہیں ہوتا۔“

شیرباز کی سکیم کا اندازہ مجھے پہلا تیکا کھا کر ہی ہو گیا تھا؛ چنانچہ میں نے اسی حد تک

زبان درازی کی تھی جو باعثِ فساد نہ ہو۔“

اگلے روز علی الصبح ہمارا کاناٹے روانہ ہوا اور ہم پر پہلی مرتبہ آراوڈی کے اسرار فاش

ہوئے۔ واقعہ یوں ہے کہ ان دنوں قبائلی علاقے میں سفر کرنے سے پہلے قبائلیوں کے چند

اعتراضات رفع کرنا پڑتے تھے۔ بد قسمتی یہ لوگ اپنے اعتراضات کے اظہار میں زبانی فصاحت

یا بلاغت کے قائل نہ تھے، بلکہ سرے سے زبان کا استعمال ہی نہ کرتے تھے۔ مثلاً آپ موٹر

میں جا رہے ہیں اور اچانک کہیں سے ایک گولی آپ کے ٹائر میں بطور اعتراض آگتی ہے

یا چلتے چلتے اپنے رستے میں پل غائب پاتے ہیں اور دو چار ذرا خونخوار قسم کے معترضین آپ

کے استقبال کے لیے آوارہ ہوتے ہیں جو بلا تکلف آپ کو موٹر سے نکال کر آپ کا روپے پیسے

اور کپڑوں کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔ آپ میں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کر لیتے ہیں اور اس کے لیے آپ سے کلمہ پڑھوانا بھی ضروری نہیں سمجھتے پھر اگر آپ ہندو ہیں تو فی الفور آپ کی مٹھی اور زردان کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور اگر مسلمان ہیں تو آپ کو صوم و صلوة کی مسلسل آسانی ہم پہنچانے کے لیے ایک فارمہیا کیا جاتا ہے جہاں صوم کا ثواب تو زیادہ تر میزبان ہی کو پہنچتا ہے؛ البتہ صلوة کا اجر آپ کی اپنی چیز ہے۔ اس خیال سے کہ آپ کی عبادت میں خلل واقع نہ ہو، آپ کو شکم پُری سے خاص طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے تا آنکہ آپ کے رشتہ دار یا حکومت آپ کو روپوں میں تول کر واپس لے جاتی ہے یا پھر وہی گوش تراشی کی نوبت آتی ہے۔

آر۔ او۔ ڈی ایسے اعتراضات کا جواب تھا۔ جس روز قبائلی علاقے کی سڑکوں سے کسی رسد کے کانوائے یا فوج کے کالم کو گزرنا ہوتا تھا، سڑک کے دونوں طرف پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوج چوکیاں جمالیتی تھی تاکہ سڑک پر آمد و رفت بغیر اعتراض جاری رہے۔ محافظ دستوں کے لیے چوکیوں پر بیٹھنا کوئی پکنک کی قسم کی چیز نہ تھی کیونکہ دوسروں کی نسبت یہ لوگ معترضین کی گولیوں اور خجروں سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والے اگرچہ محفوظ ہوتے تھے؛ تاہم ان کے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے بھی اگا دکا گولی کہیں سے آہی نکلتی تھی۔ ہمارا کانوائے روانہ ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف حفاظتی دستے اور بکتر بند گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر سکاؤٹ اور ملیشیا کے لوگ تھے جن کے انگریز افسروں نے مزی کی شلواریں پہن رکھی تھیں اور سر پر کلمہ دار گپڑیاں تھیں؛ کیونکہ اس علاقے میں کسی سر کا انگریزی ہیٹ کے نیچے سلامت رہنا کسی قدر غیر یقینی تھا۔

میرا شاہ جہاں ہمارا برگئیڈ فروکش تھا، پہنچے تو ٹام پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اونچا، پتلا، لال اور لمبی مونچھوں والا۔ بالکل ٹام؛ لیکن نہایت خوش مزاج۔ مجھے دیکھتے ہی بولا:

” تو ان بد معاشوں نے تمہیں برج کی خاطر نکال مارا ہے۔ تمہارا اپنا قصور ہے، تمہیں

برج آنا چاہیے تھی۔“

ٹام کی صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔ تواضع کے بعد اس نے حسب معمول اپنے سیکشن کے جوانوں، گھوڑوں اور خچروں سے تعارف کرایا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سرنگ گھوڑے کے متعلق ٹام کے تعارفی الفاظ خاصے لرزہ نيز سے تھے اور مجھے اس سے ذرا دور سے ہی مزاج پُرسی کی ہدایت کی گئی۔ اس گھوڑے کا جمنٹل نمبر ۲۲ تھا۔

ٹام دوسرے روز سیکشن ہمارے حوالے کر کے پشاور چل دیا اور ہم اپنے برگڈ کے ساتھ دتاخیل کو روانہ ہوئے۔ دتاخیل افغانستان کی سرحد کے قریب واقع ہے اور فقیراپی کی جائے سکونت یعنی گردوخت سے قریب ترین برطانوی پوسٹ تھی۔ فقیراپی کا قُرب حاصل کرنے کے لیے ہمیں پل صراط کی قسم کے مقامات سے گزرنا پڑا۔ ہر چند کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہماری فوجیں پرہ دے رہی تھیں تاہم سڑک کے بعض حصے ایسے قبائلی نشانہ بازوں کی زد میں تھے جو خود تو چٹانوں کی اوٹ میں ہماری گولیوں سے محفوظ تھے، لیکن ان کی گولیوں اور ہمارے سروں کے درمیان ہوا کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا جواب ہمارے پاس ایک ہی تھا کہ کلمہ شریف پڑھیں۔ سڑک کا وہ حصہ نہایت تیزی سے عبور کریں اور باقی معاملہ خدا کے سپرد کر دیں۔ اس ٹکڑے کو عبور کرتے ہوئے ہم نے اچھے خاصے سنجیدہ بزرگوں میں سنجیدگی کی تمام علامتیں غائب ہوتے دیکھیں۔

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال

مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

البتہ وہ ٹکڑا عبور کرنے کے بعد ان میں تمام تر بزرگانہ ممکنات عود کر آئی۔

ہم سے پہلے گزرنے والوں میں سے ایک دو آدمیوں کو گولی لگی، پھر ہمارے سیکشن

کی باری آئی جو پچیس تیس آدمیوں اور اتنے ہی جانوروں پر مشتمل تھا۔ اس ٹکڑے پر قدم رکھنے سے پہلے نائیک حیات محمد نے دُعا مانگی کہ یا اللہ، ہم سب کو بچا اور ہم سے قربانی لینا ہی ہے تو ہم گھوڑا نمبر ۲۲ پیش کرتے ہیں کیونکہ اس کا علاج کچھ تیری ذات ہی کر سکتی ہے۔“ معلوم ہوتا ہے نائیک حیات محمد کی دُعا اللہ تعالیٰ تک خطِ مستقیم میں جا پہنچی، کیونکہ چند منٹ بعد تمام سیکشن بخیر و عافیت پار تھا، سوائے گھوڑا نمبر ۲۲ کے جس نے سینے پر گولی کھا کر اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دی اور اپنے این سی او (NCO) کی لاج رکھ کر فوجی ضبط کی مثال قائم کر دی۔

دناخیل کی پوسٹ (چھوٹا قلعہ) ایک خاصے کھلے میدان میں واقع ہے جس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ہمارے برگینڈ نے پوسٹ کے قریب ایک وسیع دائرے میں ڈیرے ڈالے۔ دائرے کی مختلف قوسوں میں ایک معروف قاعدے کے مطابق مختلف یونٹوں کو جگہ دی گئی اور دائرے کے ارد گرد جو پتہ قدسی حفاظتی دیوار تھی اس کی مرمت کی گئی۔

اب اگلے روز فقیر اپنی کے خلاف جنگ آزما ہونا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب چارو ناچار ایک دو روز میں جاں بحق ہو جائیں گے۔

سرحدی جنگوں کا انداز کچھ بڑا لاسا ہوتا ہے۔ ہر روز ایک معرکہ ہوتا ہے۔ کبھی کسی لشکر کے جمع ہونے کی خبر سنتے، تو اس کی گوشمالی کے لیے جاتے۔ کبھی دشمن کے گاؤں کو گھیرے میں لے کر اس کے مکان اور بروج تباہ کرتے۔ کبھی سڑک بنانے کے لیے جاتے اور کبھی آر۔ او۔ ڈمی کے لیے۔

پہلے دن ایک لشکر کی تباہی کے لیے منہ اندھیرے ہمارا کالم کیمپ سے نکلا۔ پلٹن رسالہ، توپ خانہ، سب کے سب خاموش؛ خوف کا سا عالم۔ جاں بحق ہونے کا شدید احساس! آخر میدانِ کارزار میں پہنچے تو اپنے آپ کو چند دوسرے افراد کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پایا۔ ہم سے ذرا نیچے ہماری پلٹن اور توپخانے نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔

اس سے نیچے نالہ تھا اور نالے سے پار کی پہاڑی پر دشمن تھا۔ فضا بدستور خاموش تھی۔ ہم اپنی
دور بینوں سے دشمن کی حرکات دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ایک تڑکانہ ہلتا تھا۔ دقتاً
سکوت ٹوٹا اور آواز آئی:

”ٹھک ٹھک“

یہ گویا قبائلی گولی کی SIGNATURE TUNE تھی۔ جونہی دشمن کی مکین گاہوں

اور سمت کا اندازہ ہوا، ہماری طرف سے مشین گنیں دندنانے لگیں۔ توپیں گولے داغنے لگیں۔
معلوم ہوتا تھا دشمن صفحہ ہستی سے نابود ہو جائے گا، لیکن جونہی ہمارا فار بند ہوا پھر وہی
ٹھک ٹھک شروع ہو گئی۔

رہا ہمارے جاں بحق ہونے کا سوال، تو وہ کچھ پیدا نہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ اتفاق سے
ہم اتنی بلندی اور فاصلے پر تھے کہ دشمن کی گولیوں کی زد سے باہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چٹانوں
پر بیخراوٹ کے بیٹھے، دور بین آنکھوں سے لگائے، میدان جنگ بلکہ کوہستان جنگ کا معائنہ
کر رہے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ جہاں تک ہم بالانشینوں کا تعلق تھا، پہلے دن کی جنگ اتنی
ہی خطرناک ثابت ہوئی، جتنا سینما میں جنگی فلم دیکھنا۔ لیکن ہمارے ساتھی جو دشمن کی گولیوں
کی زد میں تھے ایسے خوش قسمت نہ نکلے۔ شام کو پتہ چلا کہ اس دن ہمارے تین جوان مارے گئے
قبائلی معرکوں کا سب سے دردناک سین وہ ہوتا تھا جب قبائلیوں کے مکاؤں اور
بُرجوں کو گرایا یا جلایا جاتا تھا۔ آئیے یہ منظر دیکھیں:

ندی کے کنارے سبز اور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے
جو آج کل بالکل خالی ہے۔ سب مرد، عورتیں اور بچے پہاڑوں میں جا بیٹھے ہیں۔ کچے لیکن
صاف ستھرے مکاؤں میں قفل پڑے ہیں۔ وہ سامنے بڑی محرابوں والا مکان ہے جس کے

شناختی نمبر

ساتھ ایک بلند وبالا اور دلکش سا برج ہے۔ یہ غالباً گاؤں کے ملک کا مکان ہے۔ خطی فرج کی آڑ میں سفرینا کے چند دستے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی خاص شریہ آدمی کا مکان اور کبھی گاؤں کا گاؤں زمین کے برابر کر دیتے ہیں۔ بڑے برج کا گرنا ایک نظارہ ہے جس پر ہر ایک کی آنکھ لگی ہوئی ہے اور جو نہی اس کی بنیادوں میں بارود کا دھماکہ ہوتا ہے چشم زدن میں وہ سرو قامت برج چکنا چور ہو کر ایک بے معنی سا طبع بن جاتا ہے۔

لیکن قبائلی اس حرکت پر کچھ بے جا طور پر مشتعل نہ ہوتے۔ وہ اسے بھی جنگ کا ایک حصہ سمجھتے۔ دن کو ان کے مکان مہار کیے جاتے، لیکن رات کو وہ لوگ آتے، اپنی فصلوں کو پانی دیتے، ہل چلاتے اور مکانوں کا گرنا گویا ایک موسمی حادثہ سمجھتے اور دوبارہ تعمیر کر لیتے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا:

اگر کسی دن کوئی اپریشن نہ ہوتا، تو قبائلی تفریحاً ہی کچھ ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ ایک مرتبہ ہمیں ہفتہ بھر کیمپ سے باہر جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ ایک دن تو قبائلی خاموش رہے، لیکن دوسرے روز اس پھکی زندگی سے تنگ آکر انہوں نے غروب آفتاب کے وقت ہمارے کیمپ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک گولوں گولیوں کی جوابی بارش نہ برسا دی گئی۔ ایسی کیا برونق مہیا ہونے سے بظاہر ان کی تشفی ہو گئی، کیونکہ پھر وہ آرام سے سو گئے۔

اس کے بعد ہر روز شام پہاڑ کے کسی کونے سے مصرع طرح کے طور پر ایک قبائلی گولی آہنگتی اور یہ شعر گونی اس وقت تک جاری رہتی جب تک جواب میں ایک پوری غزل پیش نہ کر دی جاتی۔

ہم میں سے اکثر سامعین کے زمرے میں تھے اور اگرچہ باہر سے آنے والی گولی کا

واجبی ساڈر بھی رہتا تھا تاہم ہر شام کا تماشا کچھ ایسا جزو زندگی بن گیا تھا کہ کسی وجہ سے
 ناغہ ہو جاتا تو ایسی ہی مایوسی ہوتی جیسے سینما ہال میں داخل ہونے پر فلم کی نمائش روک دی
 جائے۔ اسی تماشے کے دوران ایک شام ہمارا ایک خوش مزاج اور کمنہ مشق پنجر
 راہی ملکِ عدم ہو گیا اور ہمارے سیکشن میں غم کی لہر دوڑ گئی کیونکہ بقول نائیک حیاتِ محمد،
 آنجنابی کا "فیلڈ کرافٹ" کا علم اس قدر نچتہ تھا کہ اس کا ایک قبائلی گولی کی زد میں آنا باور
 نہ آتا تھا۔

لڑائی کے دنوں میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ دشمن سے نامہ و پیام بھی رہتا۔
 بلکہ کئی روز ایسا ہوتا کہ پانچ سات تو مندمند سے قبائلی ٹھوڑیوں کے نیچے سے پکڑیاں باندمے
 اور سفید چادریں تانے کیمپ میں داخل ہوتے، کالم کمانڈر سے بات کرتے اور پھر اسی
 طرح سفید پھیرے اڑاتے ہوئے تیز تیز کیمپ سے باہر نکل جاتے۔ بات خفیہ ہوتی ہوگی
 ہم تک مع تفسیر لنگر گپ کی شکل میں آپہنچی کہ قبائلی چند لاکھ روپے کے عوض صلح پر آمادہ ہیں
 یا وہ مزید ایک سال کے لیے لڑنے کا چیلنج دے گئے ہیں۔

غرض دو ماہ تک یہی انداز رہا اور جس جنگ سے بچنے کے لیے شیر باز ہمیں تنگے
 کباب کھلا کر بیمار کرنا چاہتا تھا وہ نہایت ہی صحت افزا ثابت ہوئی۔ خود شیر باز کو اس زندگی
 سے عشق ہونے لگا جس میں اور چیزوں کے علاوہ مفت اور وافر راشن کا حصہ بھی تھا۔
 جنگ اگرچہ اب ہفتے عشرے میں ختم ہونے والی تھی؛ تاہم شیر باز اور ہم ایک غیر
 معین عرصے کے لیے جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ اتنے میں اچانک پشاور سے
 واٹر لیس سے پیغام آیا:

"پشاور پہنچو، تمہاری جگہ پھر ٹام آرہا ہے۔"

ٹھوڑی دیر بعد ایک اور پیغام آیا:

”ٹام کا انتظار کیے بغیر چل دو، میرا شاہ میں ہوائی جہاز تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“
 حیران تھا کہ یا اللہ ایک خستہ نیم لفٹین کے بغیر کون سے کام بند ہیں جو ہوائی جہاز
 سے بلایا جا رہا ہے۔ بہر حال دنا خیل کو ایک ارمان انگیز سی الوداع کہی اور پٹا اور پہنچتے ہی
 ایڈجوٹنٹ صاحب کے حضور پیش ہوا۔ مجھے دیکھ کر بولے:

”تم آگئے؟ شاباش۔ اب تم سمندر پار جاؤ گے۔ تیاری کے لیے تمہیں دو دن
 دیے جاتے ہیں۔“

حکم سن کر باہر نکلا تو آگے جان واٹھٹ کھڑا تھا۔ بولا:
 ”دیکھا، یہ ان سارے جنٹوں کی سازش ہے۔ سمندر پار ٹام کو جانا چاہیے تھا۔ وزیرستان
 کی لڑائی تو اب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لیے ٹام کو وہاں بھیج دیا ہے۔ وہ کل پڑوں
 آجائے گا اور پھر یہ مزے سے برج کھیلیں گے اور تم؟ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ سر کو
 ذرا جھکا کر رکھنا!“

یہ سن کر دل کو سخت صدمہ ہوا۔ فوراً شیر باز کو طلب کیا اور بکتے کباب کا آرڈر دیا۔
 ساتھ ہی برج کی کتاب منگوا کر مطالعہ شروع کر دیا۔



سات دن سمندر میں

ٹام کی جگہ ہمیں سمندر پار بھیجنا سخت فرقہ وارانہ قسم کا فیصلہ تھا۔ اگر ہم سولین ہوتے تو شاید بھوک ہڑتال یا کم از کم ریٹ پٹیشن کا انتظام کرتے، لیکن فوجی افسر تھے، ضبط کا پاس تھا۔ یونہی عارضی ساماتھے پر بل ڈالا اور سفر کی تیاری میں مشغول ہو گئے، لیکن شیر باز جو فوجی پابندیوں سے آزاد تھا، غصے سے مغلوب ہو کر باہر برآمدے میں جا کھڑا ہوا اور پشتوں میں کیپٹن گبن (ایڈجوٹنٹ) کے شجرہ نسب پر روشنی ڈالنے لگا اور اس ضمن میں چند ایسے گوشے بے نقاب کرنے کی کوشش کی جن کا مفاد عامہ کی خاطر زیر نقاب رہنا ہی ضروری تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایڈجوٹنٹ صاحب وہاں موجود نہ تھے، لیکن ان کا بھرا جو ایک باریک ریشے کا مدراسی تھا شور سن کر ادھر آنکلا۔ شیر باز نے بڑھ کر بغیر کسی تمہید کے اُسے دو ٹوکے رسید کیے۔ جس سے مدراسی بے چارے کا شیرازہ حیات تھوڑی دیر کے لیے منتشر سا ہو گیا، لیکن شیر باز نے اپنے مکوں کی شانِ نزول کی تشریح کرتے ہوئے اُسے سلی دی اور کہا:

”دیکھو مدراسی، اگر تمہارا صاحب موجود ہوتا تو یہ زحمت تمہیں نہ دی جاتی۔“
بعد میں شیر باز نے کسی قدر سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ایک منصوبہ

پیش کیا اور اس کی فوری تکمیل کی اجازت مانگی۔ اس منصوبے کے خدوخال خاصے جارحانہ تھے کیونکہ اس کا مرکزی خیال کیپٹن گبن کی زندگی کے ارد گرد گھومتا تھا۔ شیر باز پر پیار تو بہت آیا کہ ایک مخلص مگر تیز طبع پٹھان اس سے بہتر کیا فنی امداد پیش کر سکتا ہے؛ لیکن میرے اصرار پر شیر باز نے اپنی تجویز واپس لے لی؛ البتہ ایک شرط پیش کی کہ جس طرح ہو سکے بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ جاؤ، بلکہ ہماری بیماری کے لیے شیر باز نے تمام آسانیاں ہم پہنچادیں۔ مثلاً وہی شکم گداز کباب، چند زود اثر تعویذ اور بیسیوں تیر بہدف دُعائیں؛ لیکن پشاور میں ہمارے فقط دو دن باقی تھے۔ پیشتر اس کے کہ شیر باز کے کباب کارگرو دُعائیں مستجاب ہوتیں، ہمیں بمبئی کا ٹکٹ دے کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

پشاور سے چلتے وقت ہمیں ہدایت کی گئی کہ ایک دن راولپنڈی میں ٹھہر کر آرڈیننس ڈپوسٹ سے کیمپ کٹ یعنی سفری پلنگ اور غسل وغیرہ کا سامان حاصل کر لینا۔ پنڈی میں چند دوست ملے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم سمندر پار جا رہے ہیں تو انہوں نے ہمیں اسی حسرت سے دیکھا جس حسرت سے بن کھلے مڑھانے والے غنچوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایک رفیق القلب دوست کی ہمدردی تو کچھ تعزیت کی سی شکل اختیار کر گئی جسے ہم نے بھی مظلومی بلکہ شہادت کے عالم میں قبول کیا۔ ان دنوں یوں بھی غیر ملکی آقاؤں کے لیے جان دینا کوئی بر خورداری کی علامت نہ سمجھا جاتا تھا اور ہم پر تو مزید ستم یہ ہوا کہ چند گوروں کی برج کی خاطر موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے تھے۔ بہر حال ان تمام ناگمانی، لیکن ذرا شیر گرم بلاؤں کی دُعا مانگتے ہوئے جو ہمارے سمندر پار جانے میں حائل ہو سکتیں، ہم نے سفر جاری رکھا۔ مثلاً یہ کہ ریل پٹری سے اتر جائے اور ہمیں معمولی سی چوٹیں آجائیں، مگر پٹری نہ ٹوٹے، لیکن گاڑی دُعاؤں اور تمناؤں کو نظر انداز کرتی ہوئی صبح و سالم بمبئی پہنچ گئی گاڑی سے اترتے وقت طبی نقطہ نگاہ سے ہم فوری طور پر لٹائے جانے کے قابل تھے۔

بمبئی میں ہمیں ٹرانزٹ کیمپ میں رکھا گیا۔ معلوم ہوا کہ جہاز دو دن کے بعد روانہ ہوگا؛ چنانچہ ہمیں حکم ملا کہ ان دونوں میں امبارکیشن آفس سے اپنے سفر کے کاغذات وغیرہ حاصل کر لو۔ عام لوگوں کو دفاتر سے کاغذات برآمد کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے، لیکن ہم عام آدمی نہ تھے، ایپارٹر کے فدائی تھے۔ کفن بدوش نہ سہی لیکن شناختی تختی گلے میں ڈال رکھی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ امبارکیشن دفتر کے دروازے پر دستک دیں گے تو تمام افسر جو بہر کیف دوسرے درجے کے غیر لڑاکا قسم کے افسر ہیں، بعد تو وضع ہمارا استقبال کریں گے اور اگر ہمارے گلے میں ہار وغیرہ نہ بھی پہنا سکے، تو ہمارے کاغذات منٹوں میں تیار کر کے ہمارے حضور پیش کر دیں گے۔ آخر ہم انہی لوگوں اور ان کے بال بچوں کی سلامتی کی خاطر ہی، مٹھیلی پر جان رکھ کر عرصہ کارزار کو جا رہے ہیں۔ مگر دفتر میں گئے تو گھنٹہ بھر تو وہ کمرہ ڈھونڈتے رہے جہاں سے ہمیں کاغذات ملنے تھے۔ دو گھنٹے باریابی کے لیے انتظار کرنا پڑا، اور جب آخر باریابی کا وقت آیا، تو دفتر کا وقت ختم ہو گیا۔

دوسرے دن صبح وقت پر گئے۔ اپنی جان بازی کا معاملہ کیمپ میں ہی چھوڑ گئے۔ وطن عزیز کے دستور کے مطابق دفتر میں جا کر کسی واقف کا سراغ لگانے کی کوشش کی معلوم ہوا کہ ایک کلرک ہمارے ضلع کارہنے والا ہے۔ اُس سے ملے اور ابھی چائے کی پیالی ختم نہیں کی تھی کہ کاغذات تیار ہو کر آ گئے۔

ٹرانزٹ کیمپ میں ہمارے چند اور جانفروش ساتھی سمندر پار جانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ شام کو اعلان ہوا کہ صبح جہاز پر سوار ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ دوسرے روز بندرگاہ پر پہنچے۔ یہ تھا جہاز اور یہ تھے ہم، لیکن سوار ہونے کا حکم نہیں مل رہا تھا۔ پاس سے ایک حاکم نما سے حضرت گزرے تو ان سے وجہ تاخیر پوچھی۔ بولے: ”کچھ نہیں ذرا کاغذی رکاوٹ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔“ یعنی وہی پرانا قصہ تھا۔ کوئی فیسٹ پرست افسر اپنے اڑیل کلرک کی انگیخت

پر کسی ضروری کاغذ پڑ بیٹھ گیا تھا۔ چنانچہ شام ہو گئی اور ہر دو گُل محمد اپنی جگہ سے پہلے نہ جہاز۔
ہمیں حکم ملا کہ واپس کیمپ جا کر حکم ثانی کا انتظار کرو۔

○ DELAYED ACTION معاً مجھے خیال آیا کہ شاید شیر باز کی دُعا میں

کی خصوصیت ہو اور اب وہ آہستہ آہستہ قبول ہو رہی ہو اور یہ کہ شاید ہمارا سمندر پار
جانے کا حکم ہی منسوخ ہو جائے۔ ساتھی سوائے ایک کے سب انگریز تھے اور وہ ایک
نہ صرف ”گرائیں“ نکلے بلکہ ہم خیال بھی۔ انہیں بھی انگریزی شہادت میں ایسی کشش نظر
نہ آتی تھی؛ چنانچہ ہم دونوں نے ایک مشترکہ دُعا مانگی:

”اے بھروسہ کے مالک، ہمارا سمندر پار کا سفر ٹال دے۔“

کیوں اور کیسے؛ یہ باریکیاں ہم نے اللہ میاں پر چھوڑ دیں۔ ہم نے دُعا کے اس
پہلو پر البتہ بہت زیادہ زور دیا کہ فوری توجہ کی مستحق ہے، لیکن خدا جانے ہماری دُعا میں کوئی
ٹائپ کی غلطی رہ گئی تھی یا لیبیل غلط لگ گیا تھا؛ صبح جاگے تو حکم ہوا کہ جہاز سہ پہر کو ننگراٹھائے
گا۔ مسافر بارہ بجے بندرگاہ پر پہنچ جائیں۔ اسی شام ہم اپنے کیمپ میں بیٹھے مغرب کو رات تھے
ہمیں اتنا ہی اندازہ تھا کہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ منزل مقصود
کو نسا مقام ہے۔ لڑائی ان دنوں مصر سے آگے لیبیا میں مسوینی کی فوجوں کے خلاف ہو
رہی تھی؛ چنانچہ خیال تھا کہ سویز یا پورٹ سعید اتریں گے، لیکن دوسرے روز ہی کسی نے
کان میں آکر کہا: ”بصرہ اتریں گے، لیکن بتانا کسی کو نہیں۔“ ہم نے کسی کو نہ بتایا یعنی سوائے
اپنے دوست کے، لیکن اُسے پہلے ہی سے علم تھا اور ہمیں بتانے کے لیے بے تاب تھا۔
جنگ گھنٹوں میں سب کو معلوم ہو گیا، لیکن سرکاری طور پر ہماری منزل بڑی کامیابی سے خفیہ
رکھی جا رہی تھی۔ پچھلے پہر جہاز کے ملازم سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کی صبح کو بصرہ
○ تاخیری عمل تمام طور پر اُس بم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ایک خاص وقفے سے چھٹتا ہے۔

پہنچیں گے۔ یہ تفصیل غالباً TOP SECRET (نُخبہ ترین) شمار ہو رہی تھی۔

جہاز کے لنگر اٹھانے کے بعد لبطا ہر کوئی ایسا امکان نہ تھا کہ ہمارے سفر جنگ میں کامیاب رکاوٹ پڑ سکے؛ لہذا جہاز کو خانہ خویش سمجھ کر اس کے کوچہ و در دیکھنا شروع کیے۔ ہمارا پہلا سمندری سفر تھا۔ جہاز کا کونا کونا دیکھ مارا، لیکن شاید یہ ہماری فالسوہیتی کا فیض تھا کہ اچانک جہاز نے ہمارے پاؤں سے نکل کر ہمارے گرد چکر لگایا۔ ہمارے اعضاء نے یکے بعد دیگرے ہمیں خیر باد کہا اور ہم مشکل سر کو تھامے کہیں میں پہنچے اور دراز ہو گئے۔

یہ سمندری علالت بھی عجیب علالت ہوتی ہے۔ اچھا بھلا آدمی بیٹھے بیٹھے اپنے آپ پر گرفت ڈھیلی پاتا ہے۔ ہوش و حواس درست ہیں، لیکن اُن کی دُرستی کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اعضاء پر اختیار نہیں۔ اس مکمل بے بسی کے عالم میں زندگی پر ایک گہری سیوت محیط ہو جاتی ہے اور غریب مسافر اپنے آپ کو بھرے جہاز میں مجبور و معذور پاتا ہے۔ اس بے چارگی میں ہمارا دستگیر ایک گوانی ملازم بنام لوبو تھا، لیکن لوبو شوقِ خدمت میں فقط دستگیری کا قائل نہ تھا۔ اگر آپ کو ان دنوں جہاز "اسلامی" سے سفر کا اتفاق ہوا ہو اور لوبو کی خدمت سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہو تو آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ لوبو کے فن پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنا مناسب نہیں۔ مختصر یہ کہ اُستاد لوبو بڑے صحّت بخش فنکار تھے۔

سفر کا دوسرا اہم واقعہ ایران کی جنگ تھی۔ ہر صبح اور شام جہاز کے ڈرائنگ روم میں واٹر لیس سے مُرتب کردہ خبر نامہ بورڈ پر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ روانگی کے دوسرے یا تیسرے روز خبر آئی کہ اتحادیوں نے ایران پر حملہ کر دیا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے یہ حملہ ہندوستانی فوج ہی کے چند دستوں کی مدد سے کیا تھا؛ تاہم ہمیں ایرانی بھائیوں سے بھی ہمدردی تھی۔ ہمارے انگریز ہم سفر تو ایرانی فوجوں کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن ہم چاہتے کہ اگر وہ جیت نہ بھی سکیں، تو دادِ شجاعت دے کر ہاریں؛ چنانچہ دوسری صبح ہم کسی قدر بے تابی سے خبر نامہ

پڑھنے گئے، لیکن یہ سُرخ دیکھ کر ہمیں حیرانی ہوئی کہ ایران میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہے۔

تفصیل اس اجمال پر طال کی یہ ہے کہ انگریزوں اور روسیوں نے ایک دن کسی اشتعال کے بغیر ایران پر حملہ کر دیا۔ اہل ایران کو اس بد تمیزی پر غصے سے زیادہ حیرت ہوئی اور پیشتر اس کے کہ غصہ آتا اور اس کے اظہار کے لیے میدان جنگ میں اُرتے، دغا باز حملہ آوروں نے میدان جنگ سمیت ایران پر قبضہ کر لیا۔ حق بات یہ ہے کہ ایرانی بے خبری میں مارے گئے۔ ویسے ان کی فوجی قوت کا معیار بھی وہ نہ تھا جو آج ہے۔ یہ اسی لڑائی کا شاخسانہ تھا کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی تخت سے دستبردار ہو گئے اور موجودہ شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی تخت نشین ہوئے۔

مبئی سے بصرہ تک ایک ہفتے کا سفر تھا جو ایسا طویل تو نہ تھا، لیکن آخری دو تین دن تو ہم خشکی کے لیے ترس گئے۔ ہر طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ چھوٹا سا جہاز تھا اور تھوڑے سے مسافر اور سب کے سب مرد۔ متواتر وہی چہرے دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے سے تنگ آ گئے تھے اور چند ہم سفر کی دید تو بے حد اشتعال انگیز تھی۔ پاس سے گزرتے تو جی چاہتا کہ اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں، لیکن اغلب ہے کہ وہ بھی ہماری شکل و صورت سے بیزار ہو کر خون جگر پی رہے تھے۔ بہر کیف دونوں فریقوں نے صبر کا دامن نہ چھوڑا اور باہمی رواداری کا پردہ سر عام چاک نہ ہوا، بلکہ جی کڑا کر کے ایک دوسرے سے علیک سلیک بھی کرتے رہے۔

آخر چھٹے دن غروب آفتاب سے کچھ پہلے ایک صاحب خوشی سے چلا اُٹھے: ”وہ دیکھو خشکی!“ ساری عمر خشکی پر گزاری تھی اور اس عرصے میں غالباً اسے دیکھا بھی ہوگا، لیکن اُس روز محسوس ہوا کہ سچ مچ ہم خشکی دیکھے بغیر ہی اس پر قیام پذیر رہے ہیں۔ چنانچہ

بالکل اسی انداز سے جیسے سرکس دیکھتے ہیں، ہم نے زمین کے اس ٹکڑے کو دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد شط العرب میں داخل ہوئے تو دونوں طرف دُور فاصلے پر کھیت اور انسان نظر آنے لگے۔ انہیں دیکھنا تھا کہ ہمارے دلوں میں بھی بنی نوع انسان کے لیے جن میں ہمارے ساتھی بھی شامل تھے، محبت کے چشمے پھوٹنے لگے۔ ایک دوسرے کو سمندر میں پھینکنے کے ناپاک منصوبوں کا شرمندگی سے اعتراف کیا اور پشیمان انگریزوں کی طرح انہیں واپس لیا۔ جب ڈنر سے فارغ ہو کر اپنے کمروں کو لوٹے، تو جہاز پر ایک مکمل اور پُر امن بقائے باہم (PEACEFUL CO-EXISTENCE) کا عالم تھا۔

صبح ہوئی اور جاگے، تو ہمارا جہاز بصرے کی بندرگاہ میں کھڑا تھا۔ بڑے اشتیاق سے باہر جھانکا کہ اس نئے ملک کا ناک نقشہ تو دیکھیں۔ ایک نوٹس بورڈ پر نظر پڑی، لکھا تھا:

”سامان پر نگاہ رکھیں اور چوروں سے ہوشیار رہیں۔“

اطمینان ہوا کہ الف لیلیٰ کی اس رومان انگیز سرزمین اور ارضِ ہند میں کم از کم ایک قدر ضرور مشترک ہے، لیکن سوچا کہ عراق اور ہندوستان کی مشابہت کا یہی عالم ہے، تو ہمارا سفر بیکار رہا۔ کیا اس سے یہی بہتر نہ تھا کہ پشاور میں ہی اپنے مال و اسباب کی خبرداری کرتے رہتے۔ لیکن آئندہ چند ماہ میں جب بصرہ و بغداد کو ذرا قریب سے دیکھا اور وہاں کی زندگی کے کچھ دوسرے گوشے بے نقاب ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس خطے کی رنگینیاں شہزاد کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گئیں، بلکہ

آج بھی اس دس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشین

بصرہ اور شائبہ کمپ

بصرہ اگرچہ پہلے نہ دیکھا تھا، تاہم ذہن اس کے تصور سے یکسر خالی نہ تھا۔ مثلاً بچپن میں جغرافیہ کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا، اس سے بصرے کا تصور سُرخِ مِلٹھی کھجوروں کی شکل میں ہمارے دماغ میں محفوظ تھا۔ انہی دنوں کے امتحانوں کے ”گھوٹے“ کی پیمانہ یاد یہ بھی تھی کہ بصرہ لندن یا ٹمبکٹو کے رستے میں ایک بحری یا ہوائی اڈہ ہے۔ اگرچہ اس اڈے کا تصور مزنگ کے ٹانگوں کے اڈے سے مختلف نہ تھا، پھر بڑے ہو کر ان فوجیوں سے بصرہ کے قصے سُنے تھے جو پہلی جنگِ عظیم میں اسی بندرگاہ پر اتر کر میسو پوٹیمیا کے میدان میں کام آئے تھے یا یوں کہیں کہ بیکار گئے تھے۔ کام آنے والوں نے آکر کیا قصے سنانے تھے؛ اور بعد میں شاید ان ہی فوجیوں کے طفیل بصرہ ہمارے لوگ گیتوں میں بھی گھس گیا تھا۔ مثلاً وہ پنجابی گانا:

چھٹی رن گئی، بصرے نوں گئی،

تے موڑیں باوا ڈانگ والیا سردارا

د اگرچہ گیت کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود خاتون نے بصرے میں گھسنے

○ رٹنے کے لیے طلباء لاہور کی اصطلاح

کی کوشش کی تھی۔ اللہ جانے کیوں؟

جہاز سے اترے تو معلوم ہوا کہ ہماری منزل بصرہ نہیں، بلکہ بصرے سے کوئی پندرہ میل مغرب میں ایک بہت بڑا کیمپ ہے جسے شاہ کیمپ کہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس مقام کا عربی نام تو شعیبہ ہے لیکن اس کا "ع" انگریزوں کے حلق میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ ناموں کے سلسلے میں ہم انگریزوں کی زیادتی سے اپنے ملک میں بھی آشنا تھے۔ مثلاً حیدرآباد کا انگریزی نام ہائڈرا بڈ تھا اور کھنیر کا کیشمیہ۔ لیکن عراقی ناموں کے ساتھ تو انگریزوں نے اچھی خاصی سکھانا ہی مچا رکھی تھی۔ مثلاً بغداد بیگ ڈیڈ تھا۔ موصل کو موزل کہتے تھے اور معقل کو مارگل بنا دیا تھا۔ انگریز تو خیر اپنے حلق کی بے بضاعتی کی وجہ سے شاید غلط تلفظ پر مجبور تھے، لیکن حیرت بلکہ رحم ان ہندوستانیوں پر آتا تھا، جنہیں اپنی فلاح بیگ ڈیڈ کہنے میں ہی نظر آتی تھی۔ سرزمین عراق کے وہ پندرہ میل جو بصرہ اور شاہ کیمپ کے درمیان تھے، ہماری زندگی میں ایک انوکھا تجربہ تھے۔ ہم نے اس سے پہلے کبھی ایسا اصلی ریگستان نہ دیکھا تھا۔ خود بصرہ تو جبلہ کی گزرگاہ کے طفیل بہت سرسبز اور شاداب تھا اور کھجوروں کے درخت تو وہاں انسانوں سے بھی زیادہ تھے، لیکن بصرے سے باہر نکلتا تھا کہ سبزہ یک قلم غائب ہو گیا اور انسان بھی تقریباً غائب۔ حدنگاہ تک تو ودق اور ہموار ریگ زار تھا جس میں کسی عمودی شے کا وجود نہ تھا، سوائے کسی بھٹکے ہوئے گدھے یا بکے ہوئے اونٹ کے جو دور افق پر نظر آتے تھے۔ اگرچہ ان کے وہاں ہونے کی بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ پانی تھا، نہ نباتات۔ بقولِ عالی "خدا کی زمین بن جتی سرسبز تھی"۔ ممکن ہے کہ اس ضمن میں گدھوں اور اونٹوں کا کوئی اپنا زاویہ نگاہ ہو، لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ان کے تاثرات معلوم کر سکتے ہمارا قافلہ رواں تھا اور ہم برابر دیدے پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں گھاس کی واحد پتی ہی نظر آجائے لیکن نہ آئی۔ سعدی کا شعر یاد آیا۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفترست معرفت کردگار

اور محسوس ہوا کہ ہم خواہ کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں، شاہد کے نواح میں ہمیں معرفت کردگار
ذرا مشکل سے ہی میسر ہوگی۔ ہمارے ایک ساتھی جو سید تھے، بولے:

”بجا کہتے ہو دوست، شاہد کردگار سے زیادہ کربلا کے نزدیک ہے۔ یہاں پتے
دیکھ کر نہیں، بلکہ سردے کر معرفت حاصل کی جاتی ہے۔“

سو چاکہ اگر سعدی شیراز کی بجائے شاہد میں پیدا ہوتے، تو معرفت کا ایسا آسان
نسخہ تجویز نہ کرتے۔

شاہد کیمپ میں پہنچے، تو پہلی مرتبہ انسان نظر آئے یعنی ہندوستانی اور برطانوی فوجوں
کے سپاہی۔ شاہد ایک RE-INFORCEMENT CAMP تھا۔ یعنی اس میں فوجی لوگ
مخاز جنگ پر بھیجنے کے لیے تھوک کے طور پر رکھے جاتے تھے۔ اس وقت ہمارے دو
ڈوئیزن مخاز پر تھے اور ان دونوں کو ملک شاہد سے ہی جاتی تھی۔ کیا سپاہی، کیا افسر، کیمپ
میں مسافر ہی تصور ہوتے تھے اور کیمپ میں آنے کے بعد چند دنوں میں آگے مخاز پر بھیج
دیے جاتے تھے، لیکن یہاں خدا کے کچھ پراسرار بندے ایسے بھی تھے جنہیں فطرت نے مفت خودی
کا لازوال شوق بخشا تھا اور جنہوں نے تمام تر جنگ شاہد کے لنگر خانوں اور میسوں میں ہی گزار
دی تھی۔ فوج میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ جو لڑ کر جنگ جیتتے ہیں اور وہ جو کھا
کر جیتتے ہیں۔ شاہد کیمپ میں دونوں قسمیں پائی جاتی تھیں۔ جگر گداز منظر اس گھڑی ہوتا تھا
جب ایک کھا کر جیتنے والے کو مخاز جنگ پر جانے کا حکم ملتا تھا اور غریب ٹال نہ پاتا تھا۔ ہم نے
چند ایسے ہی مناظر دیکھے اور ہر مرتبہ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

○ ایک عقلمند آدمی کی نگاہ میں درختوں کے پتے بھی خدا کی معرفت کا دفتر ہیں ○ امدادی لشکر گاہ

ایک کپتان صاحب کا وقتِ سفر کبھی نہ بھولے گا۔ یہ حضرت شائبہ کے بانیوں میں سے تھے اور آپ نے اپنا تمام وقت اس چھوٹے سے دائرے میں گزار دیا جس کا مرکز کیمپ کا میس تھا۔ حضور کا بڑا ثقیل سامان تھا جو چھوٹی سی پر ختم ہوتا تھا۔ مزاج میں رنگینی تھی اور اکثر اپنی شجاعت اور عشق کی داستانیں سنایا کرتے تھے، بلکہ ان دنوں اپنی مراد آبادی معشوقہ کو بصرہ میں لانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اچانک ایک دن آپ کو محاذ پر جانے کا ذرا اٹل سا حکم مل گیا۔ کیا بتائیں کہ اس مجاہد نے اس مہم سے بچنے کے لیے کیا کیا بہانے تراشے؟ آپ نے جملہ انگریز افسروں کو باواز بند خبردار کیا کہ یاد رکھو اگر ہمیں محاذ پر بھیج دیا، تو شائبہ ویران ہو جائے گا۔ ہندوستانی فوج کا مورال تباہ ہو جائے گا۔ پیچھے مراد آباد کا WAR EFFORT برباد ہو جائے گا اور ادھر سلطنتِ برطانیہ کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ دلائل بے شک وزنی تھے، لیکن ظالموں نے ان کا وزن کرنے سے ہی انکار کر دیا اور آپ کو اس لاری پر سوار ہونا ہی پڑا جو ایک صبح محاذ کو مکملے کر جا رہی تھی۔ اس قیامت خیز ساعت میں آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے جنہیں دیکھ کر سارے شائبہ پر رقت طاری ہو گئی، لیکن لاری کا حرکت کرنا تھا کہ حاضرین میں ایک بے پناہ قہقہہ گونج اٹھا۔ ایک دل جلے نے مراد آبادی معشوقہ کو پکار کر کہا: ”تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشا ایست“

اس وسیع کیمپ کے دو حصے تھے جنہیں ونگ (WING) کہتے تھے یعنی برٹش ونگ اور انڈین ونگ۔ برٹش ونگ میں فقط گورافواج تھیں اور ان کے افسر۔ یہ ونگ کیمپ کے غربی سرے پر تھا۔ شرقی حصہ انڈین ونگ تھا۔ اس میں ہمارے ہندوستانی سپاہی اور ان کے افسر رہتے تھے۔ ان دنوں انڈین آرمی کے افسر بھی زیادہ تر انگریز ہی ہوتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ایسی افسر بھی خاصی تعداد میں آنے لگے تھے۔ ان میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی سب

○ جنگی تیاریاں

تھے جو باہم شیر و شکر تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستان میں فوج کو چھوڑ کر زندگی ایک مسلسل ہندو مسلم جنگ تھا جس میں اکثر سکھ بھی مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شامل ہو جایا کرتے تھے اور فقط پارسی ہی اس بزمِ خیر و شر کو ساحل سے دیکھتے تھے، لیکن فوج میں تمام دیسی افسر ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور اگر خدا واسطے کا بیر تھا تو صرف انگریز افسروں سے۔ ہندوستان کی محکومی کی وجہ سے شاید ہم لوگ کچھ ضرورت سے زیادہ حساس بھی تھے اور خواہ مخواہ انگریزوں سے الجھنے کو جی چاہتا تھا، لیکن جنگ چھڑنے کے بعد بظاہر برٹش افسروں میں بھی قصابوں اور کنجڑوں کی بھرتی ممنوع نہ تھی۔ پھر عہدے کے لحاظ سے یہ لوگ اُن دنوں ہم سے تقریباً ہمیشہ سینئر ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ دیسی اور انگریز افسروں میں اچھی خاصی فرقہ وارانہ کشیدگی رہتی تھی اور اسی وجہ سے افسروں کے میسوں میں بارہا نقص امن کی وارداتیں ہوئیں۔

شائبہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ انڈین ونگ میں اگرچہ اکثریت انگریز افسروں کی ہے، تاہم ہندوستانی افسروں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ چنانچہ خوشی ہوئی کہ شائبے کا چند روزہ قیام خوب گزرے گا، مگر ابھی بستر بھی نہ کھلا تھا کہ حکم ملا: ”تم برٹش ونگ میں قیام کرو گے“۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کیمپ میں صرف رائل سگنلز کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ انڈین سگنلز کا کوئی آدمی یا ٹھکانہ نہ تھا۔ چار ماہ کے ناپختہ سیکنڈ لفٹیننٹ کو اپنی برادری سے اُدھیڑ کر اجنبی گوروں یعنی مخالفین کے سپرد کر دینا سامراجی تشدد کی ایک اور مثال تھی، لیکن کانگریسی تو تھا نہیں کہ لاری کے آگے لیٹ جاتا۔ بس دانت پیس کر زیر لب ہی اپنے جذبات کا اظہار کر لیا۔ دل ہلکا ہوا، تو بوری بستر اٹھایا اور برٹش ونگ جا پہنچا۔ وہاں ہر طرف گورے ہی گورے تھے۔ کیا افسر کیا سپاہی، بلکہ بیرے خانائے تک انگلستان ساختہ تھے۔

ایک گورا سپاہی ہمیں بطورِ اردنی بلا۔ اُس نے آتے ہی ہمیں سلیوٹ کیا اور بغیر بات کیے ہمارا بستر لگایا۔ سامان قرینے سے رکھا۔ جوتے پالش کیے اور چائے لایا۔ ایک انگریز کو یوں

دن دہاڑے اپنی خدمت کرتے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے سچ مچ ہماری صاحبقرانی کی ابتدا ہو رہی ہے۔ معاہدے خسروانہ ذہن میں یہ خیال آیا کہ سب انگریزوں کو بددماغ سمجھنا مناسب نہیں ہوتا؛ چنانچہ ہم اس گورے غلام کے لیے اب سراپا شفقت تھے۔

جب گورا کارِ خدمت سے فارغ ہو چکا تو پہلی مرتبہ ہم سے ہم کلام ہوا، لیکن کلام کیا تھا ایک لہراتی سی انگریزی نما آواز ہمارے سامنے سے گزر گئی، لیکن ہمارے دماغ پر کوئی قابلِ فہم نقش نہ چھوڑا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر گورے نے اپنی بات پھر دہرائی، لیکن ہمارے دماغ کے نقش بدستور دُھندلے اور تجریدی قسم کے تھے۔ گورا اب خاموش کھڑا تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ ہم ہی کچھ کہیں؛ چنانچہ گلا صاف کیا اور اپنی بہترین انگریزی میں اظہارِ مذہا کیا۔ گورے اُردلی نے ہماری انگریزی کی داد میں ایک مخلصانہ مسکراہٹ ضرور پیش کی، لیکن جہاں تک اس انگریزی کے ادراک کا تعلق تھا، ظاہر تھا کہ غریب سراسر معصوم ہے۔ بغیر مزید تجربے کے ہم نے طے کر لیا کہ ہماری اور گورے کی گفتگو میں کوئی نقطہ اتصال نہیں اور یہ کہ اگر ہم نے مشقِ سخن جاری رکھی، تو ہماری انگریزی بالکل متوازی پگڈنڈیوں پر ایک دوسرے کو چھوئے بغیر چلتی رہیں گی؛ چنانچہ زبان کی بجائے ہاتھوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور بلا تکلف ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ بقولِ داغ:

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے

شام کو برٹش ونگ کے افسروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ گورے اُردلی سے بھی زیادہ تواضع اور احترام سے پیش آئے۔ پہلے توجیران ہوا کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو، لیکن فوراً معلوم ہو گیا کہ ان کی شرافت کی وجہ کچھ اور ہے۔ یعنی یہ کہ ان انگریزوں نے ابھی تک ہندوستان نہیں دیکھا اور فرعونیت کا انہیں عملی تجربہ نہیں ہوا۔ وہ لوگ سیدھے ولایت سے شائبہ آئے تھے اور ایک غیر ملکی کو انگریزوں کی خاطر لڑنا دیکھ کر اسی طرح ممنون ہوتے تھے جیسے دُنیا بھر کے مسلمان محمد علی کلمے کے قبولِ اسلام پر مسرور ہوتے ہیں۔ آج محمد علی کسی اسلامی ملک میں آنکلیں تو لوگ دیدہ و دل

فرش راہ کر دیں۔ انگریزوں نے اس قسم کے اعضائے رئیسیہ تو ہمارے رستے میں نہ بچائے، لیکن ان کا انگریزی بدل ضرور پیش کیا یعنی تپاک سے مصافحہ کیا۔ چائے پلائی، لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا اندازِ ملاقات تھا۔ جو بھی ملتا اس کے چہرے پر گفتگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی گفتگو سے سرپرستی اور بے نیازی نہ پکتی تھی جو ہندوستان کے انگریز حاکموں کا ٹریڈ مارک تھا۔ وہ اپنے مخاطب کو اپنے برابر بھی سمجھتے تھے اور قابلِ عزت بھی۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن میں طبعاً اتنا نامی مزاج بھی نہ تھا کہ ان لوگوں سے گھل مل جاتا۔ محض مصافحوں یا مسکراہٹوں پر مستقل گزارا مشکل تھا۔ برٹش ونگ میں آرام ضرور تھا، لیکن گوشہٴ قفس کے آرام سے ملتا جلتا اور پھر زندگی فقط آرام کی زیادتی سے ہی عبارت نہیں بلکہ اگر آتش جوا ہو جیسا کہ وہ تھا، تو فالو آرم ایک عجیب بدنی کوفت اور ذہنی فساد کا باعث ہوتا ہے؛ چنانچہ جی چاہتا کہ بھاگ کر کیمپ کے ہندوستانی حصے میں جاؤں اور اپنے ہم وطن دوستوں کے ساتھ مل کر اودھم مچاؤں۔ اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن انڈین ونگ میں گورکھا پاسیوں کو سگنل کی پست دینے کے لیے ایک افسر کی ضرورت محسوس کی گئی اور نظر انتخاب ہم پر پڑی؛ چنانچہ بظاہر کسی قدر وقار کے ساتھ، لیکن باطن ہزار بے تابی سے انڈین ونگ میں پہنچے اور دو نفل شکرانے کے پڑھے۔ برٹش ونگ کی دھیمی دھیمی بے آوازی فضا سے نکل کر انڈین ونگ کی رنگ رنگیلی دنیا میں پہنچا، تو یوں محسوس ہوا جیسے انارکلی میں آنکلا ہوں۔ وہی انارکلی کے رنگ و صوت اور وہی گہما گہمی، لیکن عجیب بات تھی کہ عین اس وقت کوئی دیسی افسر نظر نہ آ رہا تھا؛ البتہ ایک قریب کے خیمے سے تھمتے بلند ہو رہے تھے جو لاریب افسرانہ تھے۔ حتیٰ اٹھا کر داخل ہوا، تو سبھی کو یکجا پایا۔ ممتاز قاضی، اصغر، بتالیہ، بھاٹیہ، کیانی، امیر، سوامی، نینے، نادر اور کئی دوسرے جن سے ابھی تعارف نہیں تھا، ہماری آمد کو حسبِ معمول ایک ایسے نعرے سے منایا گیا جس کا اثر شاہیے کے دیگر خیموں میں

ایک ہلکے سے زلزلے کے طور پر محسوس کیا گیا۔ پوچھا کہ فرزندِ انبند اس بند تمبو میں بیٹھے کیا سازش کر رہے ہیں، تو بتایا گیا کہ کونسل آف ایکشن کا اجلاس ہے۔

ہوا یہ تھا کہ ایک انگریز میجر بنام مڈوے (MEDWAY) نے کیپٹن اجندر سنگھ بتالیہ کے خلاف ایک کیس کھڑا کر دیا تھا یا بزبانِ فوج انہیں چارج پر رکھ دیا تھا۔ فردِ جرم میں مذکور تھا کہ ملزم کو کیرے دیکھنے کے لیے شاہی سے بصرہ جانا تھا۔ کوئی اور سواری نہ ملی تو آرمڈ کار یعنی بکتر بند گاڑی لے کر ہی تماشہ دیکھنے چلا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب ایوان کے سامنے سوال یہ تھا کہ بتالیہ کیا صفائی پیش کرے۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ ملزم ارتکابِ جرم سے صاف انکار کرے اور ثبوت میں نائک پیندا خاں ڈرائیور سے شہادت دلائی جائے دوسری تجویز یہ تھی کہ ملزم ڈٹ کر اقبالِ جرم کرے لیکن ٹریننگ کا بہانہ کرے۔ اگر پوچھا جائے کہ حرکت سرِ شام کیوں کی گئی تو عدالت کی توجہ ناٹ ٹریننگ کی اہمیت کی طرف دلائی جائے۔ یہ سوال کہ ٹریننگ کیرے پر کیوں جا ختم ہوئی تو اس کی وجہ COMPASS ERROR یعنی قطب نما کی غلطی بتائی جائے۔

مجھے یہ دوسری تجویز کچھ مذاق سا معلوم ہوئی، لیکن دوسرے روز بتالیہ نے کورٹ کے سامنے ہی صفائی لفظ بلفظ پیش کر دی۔ عدالت نے جس کے ارکان یقیناً اہل دل تھے۔ اپنے فاضلانہ فیصلے میں لکھا کہ کوئی جرم سرزد نہیں ہوا کیپٹن بتالیہ کو ایک بہتر قطب نما مہیا کیا جائے!

تھوڑے مختصر اگلی مرتبہ بتالیہ صاحب کیرے دیکھنے گئے، تو ٹینک میں تشریف لے گئے۔ ہر چند کہ انہیں ایسی سواری کی ضرورت نہ تھی، یہ حرکت محض میجر مڈوے کی خوشنودیِ مزاج کے لیے کی گئی تھی۔ مڈوے نے جب یہ خبر سنی تو اس سے زیادہ بے بس اور مضمحل انگریز برطانوی سلطنت میں اور کوئی نہ تھا۔ بے بس اس لیے کہ ابھی ابھی ایک نیا قطب نما بتالیہ کو

دے چکا تھا۔ زبان کھولتا تو نیا ٹینک بھی پیدا کرنا پڑتا۔

کیپٹن بتالیہ کی مہم نے میجر مڈوے کی شکایتوں کا تو تقریباً قلع قمع کر دیا، لیکن اُس کی بدتمیزی کا انداد مشکل تھا۔ میجر مڈوے کی بدتمیزی کچھ خداداد سی چیز تھی اور اس باب میں وہ خاصا برگزیدہ شخص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس جنس کی تقسیم کے وقت اُسے قُربِ خاص حاصل تھا اور کسی مغالطے کے تحت اُس نے اپنا دامن ذرا زیادہ پھیلا دیا تھا اور اب اس بکیراں دولت کو اس آزادی سے استعمال کرتا تھا کہ اس کی ترکیب استعمال پر داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے میجر صاحب سے کام پڑ گیا۔ اُن کے دفتر میں حاضر ہوا اور دروازے پر کھڑے ہو کر معروف انگریزی طریقے سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔

”میں ایک سیکنڈ کے لیے اندر آسکتا ہوں؟“

میجر صاحب بولے: ”ہاں آؤ۔“

اندر داخل ہوا اور ابتدائے کلام کرنے لگا، تو گھڑی دیکھ کر بولے:

”ایک سیکنڈ ہو گیا ہے، آپ جا سکتے ہیں!“

بات تو ٹھیک تھی۔ ایک چھوڑ ڈیڑھ سیکنڈ ہو گیا تھا۔ مژدبانہ سلیوٹ کیا اور باہر گیا اور سچ تو یہ ہے کہ میجر صاحب کی بدتمیزی پر پیار بھی آیا، لیکن بدقسمتی سے یہ بدتمیزی کسی قدر اُن کی پریشانی کا باعث بنی۔ ہوا یہ تھا کہ میں میجر صاحب کے پاس اُن کی ہمکلامی کا فخر حاصل کرنے کے علاوہ سرکاری کام سے گیا تھا۔ مجھے کیمپ کے کمانڈانٹ صاحب نے چند ضروری کاغذات دے کر بھیجا تھا کہ میجر مڈوے کو پہنچا دینا۔ ایک سیکنڈ کی مہلت میں یہ کاغذات پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئی؛ چنانچہ دوپہر کو جب کرنل صاحب لہجے پر ملے تو اُنہیں واپس کر دیے اور ساتھ ہی وجہ بھی عرض کر دی۔ یہ معلوم نہیں کہ بعد میں میجر مڈوے اور کرنل صاحب کے درمیان کیا گزری؛ البتہ بعد ازاں جب کبھی ہم نے میجر مڈوے کے دروازے پر دستک

دی تو وہ یہ نہیں پوچھتے تھے کہ کیا چاہتے ہو، بلکہ یہ کہ کیا لائے ہو اور جی کڑا کر کے ایک باکفایت سی مسکراہٹ کا انتظام بھی فرمادیتے۔

سچ تو یہ ہے کہ میجر مڈوے کی بدتمیزیوں ہماری زندگی کا حصہ بن گئی تھیں لیکن بد قسمتی سے ایک دو ناموافق حادثوں کے بعد میجر صاحب خوش تمیزی پر اتر آئے جس کا ہماری صحت پر خاصا ناگوار اثر پڑا یعنی ہم بڑے کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا؛ اور خالی مسلمان ہی نہیں پچھا حاجی بن گیا۔ لیکن جس چیز نے قصبہ شائبہ کو رنگین کر دیا وہ غریب مڈوے کا لمونہ تھا، بلکہ خوبان بصرہ کے لب و رخسار کا غازہ تھا۔ بصرہ شائبے سے بہت دور نہ تھا۔ یہی کوئی چود پندرہ میل۔ چنانچہ ہماری ہر شام بصرہ میں گزرتی تھی۔ پہلی مرتبہ ہم ایک اتوار کی صبح کو وہاں گئے اور یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ عراقی مرد تو ہم ہندیوں کی طرح گورے بھی ہیں اور کالے بھی، لیکن خواتین عراق سب کی سب لالہ رخ اور سمن برہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لالہ و سمن کسی قدر افلاس کے خس و خاشاک سے آلودہ تھا، لیکن ہم آملہ درجہ دوم کے متوالے ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو معطر کرنے کے لیے کافی تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بصرہ کے بازاروں کی بھکاریاں بھی اگر کسی طرح ہندوستانی ریاستوں میں پہنچ جائیں تو بغیر تعارف کے جو نیز ہمارا لیا بن جائیں۔ اس قدر بے محابا حسن کو یوں چلی پھروں میں ملبوس اور ننگے پاؤں دیکھ کر دل دکھنے سا لگا، بلکہ ہمارے ایک دوست نے تو جب پہلی عراقی حسینہ کو ننگے پاؤں دیکھا، تو تڑاق سے اُسے جوتے خرید دیے۔ فرمانے لگے:

”کیا تم ہے یار، پھولوں جیسے نازک پاؤں اور انگاروں کی سی زمین پر چلیں میری حمیت کو گوارا نہیں۔“

لیکن بعد میں جب ایسی ہی گل اندادوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے جو بلا تکلف بصرہ کے بازاروں میں ننگے پاؤں پھر رہی تھیں، تو کسی قدر سراسیمہ سے ہو گئے۔ غالباً دل ہی دل میں

آپ نے اپنی پونجی کو ان برہمنہ پاحیناؤں کی تعداد پر تقسیم کیا اور دیکھا کہ حاصل قیمت اتنا بھی نہیں کہ فی حسینہ ایک انگلی بھی ڈھک سکے۔ اس سادہ تقسیم کے سوال نے انہیں گہری رومانی دنیا سے نکال کر بصرے کے پتلے چوک میں لاکھڑا کیا؛ چنانچہ اب وہ بے پاپوش دو تیزاؤں کو دیکھتے تو ان کی حمیت کو کوئی واضح ٹھیس نہ لگتی۔

لیکن بصرہ میں باپاپوش خواتین بھی تھیں اور قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بالآخر ہمارے دوست کو پالا پڑا، تو ایک ایسی خاتون سے جس کے جوتے کی نوک میں ایک ننھاسا، پیار سا ایٹمی وار ہیڈ نصب تھا۔ ساتھ ہی اس سراپا ناز کو دھول دھپا سے بھی خاص پرہیز نہ تھا؛ چنانچہ ایک روز ہمارے دوست پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی اور غریب کسی پیش دستی کے بغیر اس خاتون کے ڈوغل حملے کا شکار ہو گئے اور ہفتہ بھر کسی کو منہ بلکہ سر دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جوتے کا جارحانہ استعمال ہندوستانی خواتین کا ہی اجارہ نہیں، بلکہ یہ سوا کی بیٹی کا عالمگیر ہتھیار ہے۔ بہر حال محض جوتے کا بپا کردہ حشر ایسی چیز نہ تھی جس سے ہمارے دوست سے جنون عشق کے انداز چھٹ جاتے؛ چنانچہ چند ہی دنوں میں آپ کے نہ صرف بال اُگ آئے بلکہ اس زود پشیمان خاتون کے دل میں مہر و محبت کے چشمے بھی اُبلنے لگے۔ آج کل جب کبھی یہ میاں بیوی ہمیں پاکستان میں ملتے ہیں، تو ہم شرارتاً سکول کے دنوں کا مصرع گنگناتے ہیں۔

المدد پاپوش جاناں سر مرا کھجلائے ہے!

لیکن حسینان بصرہ کے ساتھ ہمارے تمام معاملے شادی پر ہی ختم نہ ہوئے بلکہ بعض اوقات تو ہمیں نہایت ہی جگر خراش ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ مثلاً مسعودیہ ہوٹل کی وہ رنگین شام کہ اُس کا وسیع والان حسینوں سے پُرم تھا اور لفٹنٹ کیانی یکا یک ایک فتنہ روزگار پر کھڑے کھڑے دل لٹانے کو آمادہ ہو گئے۔ ہر چند کہ وہ کافرہ اس خراجِ عظیم کی مستحق تھی؛ تاہم

اس کا انتخاب اس اعتبار سے ناموزوں تھا کہ بیابا تھی اور اپنے دُولہا کے عین پہلو میں بیٹھی تھی۔ معلوم ہوا کہ عراقی نصرائیوں میں سے ہے اور مسز الیاس کہلاتی ہے۔ اس کے دُولہا میاں اس قدر واضح طور پر بے ضرر اور تہ دل سے یتیم نظر آتے تھے کہ کیانی نے انہیں ایک نظر دیکھا اور خارج از بحث کر دیا، پھر اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُٹھ کر مسز الیاس کے قدم جا لیے اور اُس سے تخیلے میں بات کرنے کی التجا کی۔

مسز الیاس کی زندگی میں کیانی غالباً پہلے پُجاری نہ تھے جنہوں نے اُس کے قدموں پر دل کی بھینٹ پڑھائی ہو؛ چنانچہ اُس نے سکون اور وقار کے ساتھ اجنبی کی التجائی اور پھر اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ گویا کہتی ہو کہ یہ وہ مقام ہے جہاں جواب دینا خاوند کا کام ہے اور کتنا ہی بے جان خاوند کیوں نہ ہو یہ آگ بگولا ہونے کا وقت ہوتا ہے؛ چنانچہ خاوند موصوف حسب توفیق آگ بگولا بھی ہوئے اور اُٹھ کر کچھ کمرے کو بھی تھے کہ کیانی نے اُن کے سر کو ہاتھ سے دبا کر کرسی پر بٹھا بلکہ چپکا دیا۔ کیونکہ اس کے بعد مسز الیاس نے اُٹھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اب اُن میں آگ باقی تھی نہ بگولا۔ بس ایک فیل شدہ خاوندیت لے کر حالاتِ حاضرہ کا اتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔

اب معاملہ مسز الیاس اور کیانی کے درمیان تھا۔ مسز الیاس نے موقع کا جائزہ لیا۔ کیانی کو ایک واجبی قہر سے دیکھا، پھر اُٹھی اور اُٹھ کر اس کے رخسار پر ایک ہلکا سا تھپڑ لگایا۔ وہی تھپڑ جو مردانہ بدتمیزیوں کا روایتی نسوانی جواب ہوتا ہے۔ اس سے کوئی جسمانی گزند پہنچانا مقصود نہیں ہوتا؛ البتہ اس کا اخلاقی گھاؤ خاصا گہرا ہوتا ہے۔ اس تھپڑ کو کیانی نے ایک گونہ اطمینان سے برداشت کیا۔ بظاہر اُن کی زندگی میں بھی یہ پہلا حادثہ نہ تھا۔ اگلے لمحے میں مسز الیاس کا رُوئے سخن اس چیز کی طرف تھا جو اس کا خاوند کہلاتا تھا۔ اس قابلِ احترام خاٹون نے پہلے تو اُسے گہری حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر

اُس کے بائیں گال پر ایک سنسنا تھپڑ جما کر حقِ زوجیت ادا کیا۔ تھپڑ کی گونج اور مڑوب کی چیخ سے واضح تھا کہ یہ محض اخلاقی تھپڑ نہ تھا۔ یہ ہو چکا تو مسز الیاس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور ایک تمکنت کے ساتھ تنہا ہوٹل سے باہر چل دی۔

حیدانِ بصرہ کا ذکر جتنا جمیل ہے، اتنا ہی طویل ہے، لیکن اس کی تفصیل سے احتراز ہی مناسب ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں کی زندگی تھپڑوں اور بوسوں کا ایک کھٹ مٹھا مرکب تھی اور اس میں شک نہیں کہ شاہی کے بے معنی اور بے رنگ دن محض اس لیے قابلِ برداشت تھے کہ ہر دن کے انجام پر بصرے کی بامعنی اور رنگین شام تھی، لیکن ظاہر تھا کہ بصرے کے لذائذ ہمارے قوائے عسکری پر بدترین غالب آرہے ہیں اور اگر ہم سے کوئی جنگی خدمت لینا مقصود تھا، تو یہ وقت تھا کہ ہمیں بصرہ سے نکال کر کارزار میں ڈال دیا جاتا اور یہ دن دُور نہیں تھا۔

اواخر اکتوبر میں ہمیں اچانک حکم ملا کہ فی الفور ہیڈ کوارٹر دسویں ڈویژن میں پہنچو۔ یہ جنگ آزما ڈویژن اس وقت جابانیہ میں تھا۔ وہی جابانیہ جہاں مشہور برطانوی ہوائی اڈہ تھا چنانچہ دوسرے روز شاہی اور بصرہ کو حسرتناک سی الوداع کہی اور بصرہ کے شیش سے بغداد کی گاڑی لی۔ اس سفر میں ہمارے ساتھی لفٹننٹ سپنس (SPENCE) تھے۔

گاڑی کے ڈبے میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ خلد کا در کھل گیا ہے۔ ڈبہ کیا تھا، ایک روال دوال دیوانِ خاص تھا۔ نفیس اور نرم صوفے، نازک ریشمی پردے، ملائم اور گزارقالبین۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی قلوپٹہ داخل ہوگی اور کہے گی:

”معاف رکھیے، آپ غلطی سے آگئے ہیں، یہ کمرہ میرے لیے ریزرو ہے۔“

ہم نے پیچھے وطن میں بھی پہلی مرتبہ فسٹ کلاس میں سفر کرتے وقت ذرا عیش سا محسوس کیا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ وہ احساسِ سراسر ناروا تھا اور اب کہ حقیقی عیش سے

ہمکنار تھے، ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور اپنے آپ کو کھو دیا۔

یہ ہو چکا تو ہمیں حیرت ہوئی کہ آخر عین جنگ کے زمانے میں کہ غریب عراق کو پاؤں کے لیے جوتے میسر نہیں، ان سنہری روپلی ڈبوں کی عیاشی کیا معنی؟ اور تفتیش پر معنی نکلے کہ یہ مجلاؤ مٹلا ڈبے حکومت ایران کی ملکیت ہیں یا تھے جو حافظ و خیام کے خوش مذاق ہموطنوں نے جرمنی سے منگوائے تھے کہ سفر کرتے وقت آپ رکن آباد و گلگشت مصلے کی کمی محسوس نہ ہو، لیکن گزشتہ اگست کی چند روزہ جنگ میں یہ مال غنیمت جرمنی سے آتے ہوئے انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اور بصرے میں اتار لیا گیا اور نتیجہ یہ کہ وہ عیش جو فقط تجمل حسین خاں کے لیے بنا تھا، پنس اور محمد خاں کے حصے میں آ گیا۔ یہ سفر اگرچہ گھڑیوں میں کٹ گیا، لیکن جو گھڑیاں قلوپڑہ کے آغوش میں کٹیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غنیمت ہوں گی۔

دوپہر کے قریب ہماری گاڑی بغداد پہنچی۔ ہمیں بتایا گیا کہ باہر ہمارے لیے سپندرہ ہنڈرڈویٹ کا ایک فوجی ٹرک انتظار کر رہا ہے۔ یہ سنا تو یوں محسوس ہوا جیسے قلوپڑہ نے آغوش سے نکال کر پلٹ فارم پر دے مارا ہو۔ بہر حال اس ٹرک نے ہمیں اور پنس کو جانیہ لے جانا تھا۔ (جانیہ بغداد سے مغرب میں کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے) پنس لہجے: ”اؤ ذرا جانیہ جانے سے پہلے بغداد میں تو جھانک لیں۔“ دجلہ کے پل سے گزر کر شارع رشید میں داخل ہوئے۔ یہی بغداد کا دل تھا اور ہے۔ وہی بصرہ کے سے تیور۔ اگرچہ ذرا زیادہ تکیھے۔ دختران بغداد سے نگاہ لڑی، تو محسوس ہوا کہ مقابلے میں نگاہ نہیں تیغ نگاہ ہے۔ بڑا غیر مساوی مقابلہ تھا؛ چنانچہ پیشتر اس کے کہ کوئی سنگین واردات ظہور پذیر ہوتی، ہمارا ٹرک جانیہ کی شاہراہ پر تھا۔

یہ وہی سڑک تھی جس پر چند ہفتے پہلے رشید علی کی حامی عراقی فوج کو انگریزوں کے ایک برگیڈ نے ایک دن میں شکست دی تھی۔ یہ خیال آیا اور دل میں پھر وہی کرب کا احساس

اٹھا کہ کاش یہ لوگ جیتتے یا کم از کم کچھ لڑ کر ہارتے۔

جہانہ کیمپ میں پہنچے جہاں ایک سمندر نما جھیل کے کنارے دسویں انڈین انفنٹری ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر مقیم تھا، یعنی ہماری منزل مقصود۔ اترے اور گرد و پیش کا جائزہ لیا، لیکن اس جائزے میں جھیل کے سوا کچھ پلے نہ پڑا۔ جھرد دیکھو، جھیل ہی جھیل۔ یہ باور کرنے کے لیے کہ زمین پر کھڑے ہیں، سینہ خاک کو پاؤں سے دبانا پڑتا تھا اور نہ چلتے چلتے بھی یہ احساس ہوتا کہ تیر رہے ہیں۔ جھیل کے گہرے نیلے پانی میں ایک ہیبت ناک سی کشش تھی اور بے اختیار اس میں کود پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ یعنی اپنے آپ سے مشورہ کیے بغیر۔ اور اس زخار نکھین جھیل میں کود جانا شاید ایسا صحت بخش ثابت نہ ہوتا؛ چنانچہ ہم نے اپنے آپ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور لب آب ہی سے جھیل کا تماشہ کر کے گزر گئے۔

چند قدم ہی گئے تھے کہ وہ خیمے آگئے جو ہمیں قیام کے لیے ملے تھے۔ یہ پستہ پستہ

نابالغ سے خیمے اپنے وزن کے لحاظ سے FORTY POUNDERS یعنی "بیس سیرے" کہلاتے تھے۔ مشکل ایک آدمی ان میں رہ سکتا تھا اور آدمی سے مراد آدمی ہے۔ وہ حضرات جو بیشتر پیٹ پر مشتمل ہوتے ہیں، اس خیمے کے لیے آدمی سے ذرا فالتو نکلتے۔ خوش قسمتی سے ایسے لوگ یہاں نہیں پہنچے تھے۔ سب شاہد کے لنگر خانوں میں رہ گئے تھے۔

بالآخر ہمیں ایک خیمہ ملا۔ بستر کھولا، ہاتھ منہ دھویا۔ یا بقول سنس "واش" کیا۔ کپڑے بدلے

— اگرچہ ایک خاکی جوڑا اتار کر دوسرا خاکی جوڑا پہننا کپڑے بدلنے سے مختلف فعل ہے

— اور جہانہ کے سینما میں فلم دیکھنے چل دیے۔ جی ہاں! یہاں فلمیں بھی تھیں، یعنی باقی

تمام خرافات کے علاوہ، اس لیے کہ یہاں جنگ کا زمانہ تو تھا، صرف جنگ نہ تھی۔ انگریزوں

نے اس ہوائی مستقر میں ایک طویل زمانہ امن گزارا تھا؛ چنانچہ جہانہ تفریحات و آسائش

کے اعتبار سے برطانیہ کا تخت بلکہ تختِ جگر نظر آتا تھا۔ جہانہ کی سڑکوں پر انگریز لڑکیاں اس

بیاکی سے پھر رہی تھیں گویا پکا ڈلی میں گھوم رہی ہوں۔ اگر فرق تھا تو یہ کہ جتنا جانیہ برطانیہ کی نسبت گرم تھا، اتنا ہی ان دخترانِ فرنگ کا حُسن لباس کی آلائش سے پاک تھا یعنی ہر چند کہیں کہ تھا، نہیں تھا۔ بقول شخصے اس اشتعال کو برداشت کرنے کے لیے پیغمبر ہونے کی ضرورت تھی۔ ہماری پیغمبری کے متعلق کوئی CASUALTY وغیرہ تو نہ چھپی، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہ اشتعال ہم نے کمال صبر کے ساتھ برداشت کیا۔

ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں ہمارا قیام مسافرانہ تھا کہ ایک نیم لفٹین کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ ہماری پکی منزل برگیڈ تھی؛ چنانچہ صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو ہمیں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا۔ میجر سٹیڈ نے ہمیں ۲۰ برگیڈ کے سگنل سیکشن میں ”سیکنڈ ان کمانڈ“ ہونے کی نوید دی۔ ساتھ ہی تقرر کے کاغذات دیے اور دُعا اور پیار کے ساتھ ٹرک میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔

○ فرج میں کسی شخص کی ترقی، تقرر، تبادلہ یا انعام کے متعلق کسی قسم کا تحریری اعلان ہو تو اسے (CASUALTY) چھپنا کہتے ہیں۔

صحرائے کیارہ اور برگیدہ آفیسرز میں

۲۰ برگیدہ اس وقت بغداد کے شمال میں کوئی ڈیڑھ سو میل دور کیارہ کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ ہم نے بغداد پہنچنے پر گاڑی لی۔ رات سفر میں کاٹی اور صبح سویرے کیارہ کے اسٹیشن پر اترے جہاں ایک اور اٹل ٹرک ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے برگیدہ ہیڈ کوارٹر تک اور سنیکڑوں میں اردگرد ایک پسماندہ اور پابربہنہ صحرا تھا۔ کیارہ اگر کسی آبادی کا نام تھا، تو وہ بالائے زمین نہ تھی۔ ہر طرف ویرانہ تھا۔ ظاہر تھا کہ ۲۰ برگیدہ کے لوگوں کو ان مسائل سے واسطہ نہیں جو حضرت آدم کو باغ عدن میں پیش آئے تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے سیدھا برگیدہ کے آفیسرز میں پہنچا۔ لفظ میس سے کسی عالیشان عمارت کے تصور کی ضرورت نہیں۔ سیدھا سادا فوجی خیمہ تھا۔ اندر داخل ہوا تو تمام افسرانہتے میں مصروف تھے۔ ہمارے رہبر نے پہلے برگیدہ کے صاحب سے اور پھر دوسرے افسروں سے ہمارا تعارف کرایا۔ تعارف ختم ہو چکا تو جس گفتگو میں ہم مغل ہوئے تھے، پھر سے جاری ہوئی۔ برگیدہ کمانڈر صاحب جو ایک معمر سے بزرگ تھے، ایک نوجوان کپتان سے یوں مخاطب ہوئے:

”پیٹر، تم بغداد جا رہے ہو؟“

”یس سر۔“

” تو پھر دیکھنا، شاید اُس کی کوئی بہن بھی ہو۔“

” بہن تو ہے سزا مگر “

” مگر کیا؟ “

” آپ کو جیفری سے اجازت لینا پڑے گی۔“

پلیٹرنے جیفری کا نام لیا تو ایک خوش رو کپتان قریب کی کرسی سے اٹھا۔ مگر سے

جھک کر برگیڈیئر صاحب کو سلام کیا اور بولا:

” سزا اس معاملے میں شرکت نہیں ہوتی۔“

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور خود برگیڈیئر صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔

اگر یہ مختصر سی گفتگو کسی قاری کی سمجھ میں نہ آئے، تو یہ گفتگو کا قصور ہے خود مجھ پر اس

کے رموز آہستہ آہستہ منکشف ہوئے۔ اور جب منکشف ہو چکے تو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا

کہ ایک صحت مند لیکن بہر حال بوڑھا برگیڈیئر اپنے نوجوان ماتحت افسروں سے اس حد

تک بے تکلفی کی باتیں کر سکتا ہے۔ دل نادان کو طرح طرح کے سوال سوجھے۔ شرم کیا چیز

ہے؟ جیاتی ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ضبط کیا ہوا جس پر سارا فوجی نظام قائم ہے؟

ان سوالوں کے جواب برگیڈیئر میں چند دن رہنے کے بعد ہی معلوم ہو گئے جہاں تک

ضبط کا تعلق ہے، یہ میس کی بے ضبطی صرف درون میس کی بات تھی۔ میس کے باہر وہی

حفظ مراتب تھا جو فوج میں ہوتا ہے۔ سینئر کا حکم اور جونیئر کی لبیک، خواہ تعمیل حکم میں جان ہی

کیوں نہ جائے، بلکہ یہ کہ میس کی آزادی ہی باہمی احترام اور محبت کی ضامن تھی۔ اچھی فوج

کے سپاہیوں میں ایام جنگ میں ایک عجیب و لولہ انگیز دوستی اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہو

جاتا ہے۔ ہزار قالب مگر یک جان اور جہاں ماحول ایسی بے پایاں محبت کا ہو وہاں مصنوعی

ضبط کا رشتہ غیر ضروری اور بے معنی سا ہو جاتا ہے، مگر یہ فقط عرصہ مند فوجوں کا خاصہ ہے۔

خوف زدہ اور شکست خوردہ فوجوں کا حال کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔ افسر چڑچڑے اور اپنے رعب کی حفاظت میں آستینیں چڑھائے ہوئے، باہر سے بھیرے ہوئے مگر اندر سے کانپتے ہوئے، سپاہی بزدل اور عریص۔ باہمی رفاقت کا یہ عالم کہ ساتھیوں میں سے کسی کی آنکھ چوکی، تو حسبِ توفیق اُس کی جیب یا گلا کاٹ لیا۔ ایسی فوجوں میں قیامت کی نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے اور ایسے ماحول میں جان نثاری کی نہیں جاتی، کرائی جاتی ہے۔

رہا شرم و حیا کا معاملہ تو شرم کی وہ قسم جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ ۲۰ برگیڈ کے میں تک نہیں پہنچی تھی اور اس کے لیے وہ لوگ کچھ معذرت خواہ بھی نہ تھے۔ ایک تو انگریز کا حیا کا تصور ہی ہماری دیسی حیا سے بہت مختلف ہے، پھر جنگ کا زمانہ ہو اور کیا رہ جیسا ویرانہ، جہاں شش جہات میں مرد ہی مرد تھے اور کوسوں تک کسی نسوانی گوش کے برآواز ہونے کا امکان نہ تھا تو وہاں حیا ایک بیکار بلکہ گرانبار تکلف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگرچہ غالباً دلی میں بیٹھے بیٹھے وضع احتیاط سے دم رکنے لگتا تھا تو صحرا نشینانِ کبارہ کے لیے تو پاس حیا یقیناً دمے کا باعث بنتا۔ تھوڑی سی چاک گریبانی سے حیا کا تو کچھ ایسا نہ بگڑتا تھا، لیکن ان قوم کے سرفروشوں کی صحت بنی رہتی تھی۔

یہ شاید انہی روایات کا نتیجہ ہے کہ آج بھی فوجی افسروں کا اندازِ گفتار غیر فوجی حضرات کے لیے عرق آدرنا بت ہوتا ہے اور ان کے الفاظ کا انتخاب بعض نازک طبع سولین بھائیوں کو اس شدت سے مردانہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بات سننے کی بجائے اپنی عصمت بچانا شروع کر دیتے ہیں، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ فوجیوں کا یہ طرزِ کلام ایک خاص قسم کی مردانہ معظروں تک ہی محدود ہے۔ خواتین کی موجودگی میں ان کا اندازِ تکلم یکسر بدل جاتا ہے۔ یہ فوجی روایات کا حصہ ہے کہ خواتین موجود ہوں تو یہ اکھڑ لوگ بے حد ریشمی اور ملامت گفتگو کرتے ہیں۔ ادل تو کسی کثیف موضوع کو چھیڑنا ہی خلافِ شجاعت سمجھتے ہیں، لیکن اگر کسی مہتمم پر

بادہ و ساغر کے بغیر بننے تو انہیں یہ کتنا بھی آتا ہے۔ یہ احتیاط ہمارے عوام میں کسی قدر کیاب ہے۔ عام مجالس میں لوگ خواتین کے سامنے ایسے کلمات کا استعمال روا سمجھتے ہیں جو خاصے ناروا ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری خطا پوش خواتین انہیں حافظِ قرآن نہ سمجھتے ہوئے بھی چھوڑ دیتی ہیں۔

ناشتے کی میز پر ہمارے سوا تمام انگریز تھے۔ اگرچہ تمام افسروں نے مع برگیڈیر صاحب کے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا؛ تاہم واحد دیسی ہونے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو بے باور دکھانے کا محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ خیمے کے دروازے سے ایک دیسی کپتان میس میں داخل ہوتا ہے۔ سالو لاسازنگ، باریک تیرناسی، مونچھے بال بال قرینے سے کٹا ہوا، ایک ہاتھ میں پائپ اور دوسرے میں اخبار۔ اپنے ہم وطن کو دیکھا، تو میری آنکھوں میں جیسے روشنی سی لہرائی اور انتظار میں تھا کہ میری طرف دیکھے تو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ راز کی باتیں کہہ ڈالوں کہ خوب گزرے گی۔ لیکن بد قسمتی سے کپتان صاحب کی نگاہ مجھ پر ٹپکنے ہی نہ پائی اور ایک دفعہ ذرا سی پڑی بھی، تو انہوں نے جیسے کھینچ کر واپس لے لی کچھ حیرانی سی ہوئی کہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

یا الہی یہ ماہر کیا ہے!

کپتان صاحب ناشتے کے لیے بیٹھ گئے اور برگیڈیر صاحب نے ہمارا ان سے تعارف کرایا۔ لیکن کپتان صاحب نے فقط ایک لمحے کے لیے اپنی پلیٹ سے توجہ ہٹائی بلکہ توجہ کو غالباً وہیں رکھا صرف اپنی ٹھوڑی گھائی اور ایک جمائی میں لپٹی ہوئی HOW DO YOU DO? کہہ کر ٹھوڑی اُلٹے رُخ گھا کر اسی زاویے پر لے گئے جہاں پہلے تھی۔ معاً مجھے وہ شیر یاد آیا جو میٹرو گولڈون میٹر کی فلموں کے شروع میں ٹھوڑی کو پھپھلی طرف موڑ کر ہلکی سی احتجاجی

○ تعارف کے موقع پر انگریزوں کا رسمی مجملہ: مزاج اچھے ہیں؟

انگریزی لیتا ہے اور پھر سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ شاید اسی واقعہ کا اثر ہے کہ میں آج کل بھی جب یہ شیر فلم میں دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے اسے بھی کوئی برگڈیٹر تعارف پر مجبور کر رہا ہے۔ تو فرض کر لیں کہ ان حضرات کا نام کیپٹن مہتہ تھا۔ اب مہتہ صاحب کو حق تھا کہ طبیعت کے اکٹھے ہوں، مزاج کے سنکی ہوں اور گفتار کے سڑیل ہوں۔ غرض ہر پہلو سے بدتمیز ہوں، لیکن بدتمیزی میں مساوات برتیں۔ لیکن ہوا یہ کہ مہتہ صاحب نے مجھ سے تو مقاطعہ کر لیا، مگر انگریزوں کے آگے دوہرے ہو ہو کر بچنے لگے۔ کسی سے گڈ مارنگ، کسی سے مہلو۔ خالص انگریزی انداز مگر ذرا کم خالص انگریزی زبان میں ہر ایک سے خیریت، مزاج پوچھی اور انگریزی کی عادت کے مطابق مزاج پُرسی کے علاوہ خواب پُرسی بھی کی۔ یعنی رات نیند تو اچھی آئی تھی، پھر برگڈیٹر صاحب کو مخاطب کر کے موسم پر تبصرہ کیا۔ کیونکہ ایسا نہ کیا جاتا، تو آپ کی انگریزیت ابھی خام تھی۔ وہ لوگ تو کپتان صاحب کو جانتے ہی تھے، ظاہر تھا کہ آج ان کی صاحب بہادری کی نمائش میرے استفادے کے لیے ہے اور وہ مجھے سبق دے رہے تھے کہ زہار ہمیں اپنے جیسا NATIVE نہ سمجھو۔ تم ویسی ہو تو ہو، ہم صاحب ہیں۔ اب اس خاکسار کو مرعوب ہونے میں بھی عذر نہ تھا، لیکن کچھ نہلت چاہتا تھا کہ مہتہ صاحب کا اقتدارِ اعلیٰ قبول کرنے سے پہلے ذرا انہیں تفصیل سے دیکھ تو لیں اور تفصیل میں گئے تو ہمیں مہتہ صاحب سے گہری ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ بات یہ تھی کہ کیپٹن مہتہ صاحب حقیقتاً صاحب بہادر نہ تھے۔ فقط صاحب بہادری کے مریض تھے۔ اُن سے اُلجھنا بیکار تھا، بلکہ ان کی تیمارداری کے سلسلے میں ان کی باجگزاری بھی قبول کر لی، لیکن وہ اپنی دیرینہ بیماری سے شفا یاب نہ ہو سکے اور ہمارا ویسی پن معاف نہ کیا۔ سال بھر میں ہم سے دو چار ہی باتیں کیں اور وہ بھی پاٹپ سے چھینی ہوئی انگریزی میں۔

لیکن برگڈیٹر میں کیپٹن مہتہ کے علاوہ اور لوگ بھی تھے اور خوش قسمتی سے مزاج کے

لحاظ سے بالکل غیر مہتمم۔ مثلاً میرے اپنے سگنل سیکشن کے کیپٹن مینسفیلڈ ایک متفنی مگر دلفریب شخصیت کے مالک تھے۔ سالہا سال سارجنٹ رہنے کے بعد آخری عمر میں افسر بن گئے تھے؛ لیکن جیسے عشقِ بے باں میں عمر گزارنے کے بعد مسلمانوں کے انداز نہیں آتے، کپتان صاحب کی کل و صورت یا حرکات و سکنات سے بھی افسرانہ آثار ناپید تھے۔ وہی سارجنٹوں کا درندہ ناچہرہ اور چہرے سے درندہ تر زبان۔ آپ کی ہر بات پھکڑ کی شکل میں منہ سے نکلتی۔ ذرا مزے میں آکر باتیں کرتے تو کھرام مچ جاتا۔ پاکیزہ سے پاکیزہ مضمون بھی گالی کا سہارا لیے بغیر ادا نہ کر سکتے؛ البتہ گالیاں اس قدر بلیغ کہ کوئی کھا کے بے مزہ نہ ہو۔ یوں بھی انگریزی گالیاں ہماری گالیوں کی طرح لبادہ اوڑھے بغیر وارد نہیں ہوتیں، بلکہ خاصی ملبوس اور ملفوف ہوتی ہیں۔ کپتان صاحب کی طبیعت میں تصنع نہ تھا۔ سیدھا سادا انسان اور دوستوں پر شدیداً مجھے قرب خاص حاصل تھا کہ وہ کمانڈر تھے اور میں اُن کا نائب۔ زندگی ایک مسلسل ہنسی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کام نہیں کر رہا بلکہ لگاتار مزاحیہ فلم دیکھ رہا ہوں۔ دو انگریزی الفاظ جنہیں انگریز شرفاء بولنا تو کجا، سن کر بھی بدک جاتے ہیں اُن کی زبان سے تفریحاً جھڑتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا:

”اگر یہ دونوں الفاظ آپ سے چھین لیے جائیں تو؟“

بولے: ”بس گونگا ہو جاؤں گا اور کیا؟“

لیکن اُن کا انگریزی فقرہ اتنا سادہ نہ تھا۔

“GOD AL—MIGHTY, I WILL BE—DUMB I

خالی جگہوں میں جڑاؤ کا بے نظیر کام تھا، لیکن اس کا ریگری کی اُردو میں نمائش مشکل ہے میرے پہنچنے کے بعد ہی کیپٹن مینسفیلڈ کا تبادلہ ہو گیا اور اُن کی جگہ کیپٹن شاء (SHAW) آ گئے۔ نارمن شاء کیا آئے، کیا رہ کے ویرانے میں پھول کھل اُٹھے۔ کیا خوش وضع و خوش اوقات انسان تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دوست بن گیا اور ہمیں دوست بنا

لیا۔ میرا سینہ تھا، لیکن یہ اس لیے کہ کاغذوں میں درج تھا۔ کیپٹن ثناء نے مجھے اس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہمارے جوان ثناء پر جان دیتے تھے اور وہ اسی محبت کے قابل تھا۔ برگید کے دیگر افسروں کے ساتھ ہمیں ذرا کم واسطہ تھا، لیکن رہتے ایک ہی میں تھے۔ گویا ایک ہی کنبہ تھا۔ دن میں کئی بار اکٹھے ہوتے اور راتیں تو اکثر میس میں ہی سحر کرتے۔ ولسن۔ جیفری۔ ٹرن بل۔ سپونز۔ مارگن۔ سٹمن۔ مچسن۔ ہرلی۔ ثناء اور ہمارے برگید کمانڈر رابرٹس (جو بعد میں سر اوگلوئی رابرٹس بنے) اس میس کے ارکان تھے طبیعتیں سب کی جدا جدا لیکن اپنی جگہ ہر ایک ہیرو۔

ان میں سے ایک کا ذکر ذرا تفصیل کا محتاج ہے۔ یہ تھے کیپٹن ہرلی۔ برگید میں واحد انیگلو انڈین تھے اور مجھ سے چند روز بعد آئے تھے، لیکن چونکہ پورے انگریز نہ تھے، کیپٹن مہتہ نے ان کے آنے سے کئی دن پہلے ان کے جرائم کے اعداد و شمار اور بد اعمالیوں کی فہرست شائع کر دی تھی، بلکہ ضمیر کے طور پر مجملہ افسروں کو فرداً فرداً بھی تبلیغ کرتے رہتے تھے کہ ہرلی کی آمد برگید کے لیے کس قدر مضر صحت ثابت ہوگی۔

ایک انیگلو انڈین کو بدنام کرنا نسبتاً آسان ہے کہ ایک تاریخی حادثے کی وجہ سے ان لوگوں کے خلاف یوں بھی دھیمی دھیمی نفرت ہر دل میں سلگتی رہتی ہے؛ لہذا کسی انیگلو انڈین کو مکمل طور پر نذر آتش کرنے کے لیے فقط ملامت سی بی جہالو کی ضرورت ہوتی ہے اور مہتہ صاحب تو گویا کیپٹن جہالو تھے۔ بیچارہ ہرلی برگید میں پہنچا، تو لوگوں نے ناک پر رومال رکھ لیے، لیکن ہرلی اس بد تمیزی سے ذرا برہم نہ ہوا اور اپنی گفتار و کردار سے ایسی دلکش شخصیت کا مظاہرہ کیا کہ ہمارے دلوں کو سچ مچ موہ لیا۔ مہتہ صاحب اسے اپنی شکست سمجھے۔ اتفاق سے برگید صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے اور ابھی ہرلی سے مل نہ پائے تھے کہ مہتہ ان کی خدمت میں جا پہنچا اور انہیں فی الفور فتنہ ہرلی سے آگاہ کرنے لگا۔ برگید صاحب نے پوچھا:

”ہرلی میں کیا فراہمی ہے؟“

”مہتمم بولے: ”بے شمار فراہمیاں ہیں۔“

”مثلاً؟“

”جو اُکھیلتا ہے!“

”اور؟“

”شراب پیتا ہے!!“

”اور؟“

”عورتوں کے پیچھے مہاگتا ہے!!“

برگیڈیئر صاحب بولے: ”بڑا خوش مذاق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جائیں اُسے کہیں،

آج شام چائے میرے ساتھ پیے۔“

یہ سن کر مہتمم کو سخت مایوسی ہوئی۔ بولا:

”سزا آپ کچھ ہی کہیں، میری چھٹی جس کہتی ہے کہ ہرلی اچھا آدمی نہیں ہے۔“

برگیڈیئر صاحب زور سے ہنسنے اور بولے:

”مہتمم، تمہاری چھٹی جس تو بہت تیز ہے، مگر معلوم ہوتا ہے تمہاری باقی پانچ جتیں

خاصی سست ہیں۔ دیکھتے نہیں یا کم از کم سونگھتے نہیں کہ ہرلی کس قدر زندہ دل آدمی ہے؟

جاؤ، تم بھی ایک چھوٹا دسکی پی لو۔“

کیا رہ میں فوجی طور پر بہت کچھ کرنے کو تھا۔ مورچے اور خندقیں کھودنا، فوجی مشقیں

کرنا وغیرہ۔ اور بہت کچھ کیا جاتا تھا، لیکن وہاں کی زندگی کا محور میں ہی تھا۔ وہی نیم زمین

خیمہ جس میں چوں چوں کرتی سفری میزیں اور کینوس کی کرسیاں رکھی تھیں کہ اگر کسی وجہ سے برگیڈ

کو اچانک دکان بڑھانا پڑے، تو خانہ بدوشی و بال دوش نہ ہو جائے اور یہ خانہ بدوشی ایسی

غیر اغلب بھی نہ تھی۔ کیونکہ ہمارے شمال میں بلخ بخارے کے نواح میں ہٹلر کی آمد آمد تھی اور وہ کسی وقت دیوار کی دوسری طرف کھڑے ہو کر ہم سے تو تو میں میں کر سکتا تھا۔ لیکن بظاہر کچھ دنوں کے لیے ہمارا قیام یقینی تھا اور ہمارا میس ہر چند کہ چھو کا چو بار تھا؛ تاہم ہمیں یہاں وہ آرام میسر تھا جو بلخ بخارے میں تو اب یقیناً نایاب تھا۔

زمانہ امن میں فوجی میسوں میں میزیں، کرسیاں، چھریاں، چھچھک جگ جگ کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی چھچھ یا کانٹا جگ گانے میں مزاحمت کرتا، تو افسر لوگ اسے ہتک افسری سمجھتے تھے اور بیروں، خانساموں کی جان پر بن آتی تھی، لیکن ہمارے جنگی میس کا سامان شاید جگ تو کرتا ہو، لیکن ہم نے اُسے لگ کرتے کبھی نہ دیکھا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی۔ ہم نے ان گرد آلودہ کرسیوں میں سکون کے وہ لمحے دیکھے جو فرنگی صوفوں کی آغوش میں بھی میسر نہ آسکے اور جب دن بھر کی فوجی مشقوں سے چور ہو کر شام کو میس کی کرسیوں پر آ بیٹھتے، تو معلوم ہوتا کہ سلمیٰ نے اپنی گلز باہوں میں لے لیا ہے۔

ایام جنگ میں آپ نے اپنے گھروں میں سامان خور و نوش کی کمی محسوس کی ہوگی وہ ہونا چاہیے تھی، کیونکہ اُس کی بیشی ہمارے جنگی میسوں اور لنگروں میں پڑی تھی ہمیں انگریزوں سے لاکھ شکوے سہی، لیکن وافر اور متنوع خوراک کی شکل میں جو جواب شکوہ انگریزوں نے ہمیں دیا، اُسے کوئی سپاہی نہیں بھول سکتا۔ پھر شاید انگریز رزق رسانوں کی دیکھا دیکھی قادرِ مطلق بھی ہم پر مہربان تھا اور ہمارے گرد و پیش فراوان شکار بکھیر رکھا تھا۔ عراق بیشتر صحرا ہے جہاں کھانے کو بظاہر کچھ نہیں، لیکن جتنے پرندے اور غزال عراق کے صحرا میں ہیں کسی دوسری جگہ نہ ہوں گے۔ ہم سوچتے تھے کہ ان میں عقل ہو تو عراق چھوڑ کر ہمارے ہاں چھانگے مانگے میں کیوں نہ چلے جائیں، جہاں آب کی کمی ہے نہ دانے کی، لیکن صحرا نوردوں نے کبھی ناصحوں کی بات پر کان دھرا تھا جو یہ دھرتے۔ شکار کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بندوق اٹھا کر فقط کیمپ سے

باہر نکلنے کی تکلیف کرنا پڑتی تھی۔ اس کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ امیر خسرو کہیں سے آواز دے رہے ہیں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نساہہ بر کف

با امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

شکار کا انداز یہ تھا کہ آپ جیپ میں بندوقیں تانے بیٹھے ہیں کہ بیسیوں آہو سر کف سامنے آتے ہیں۔ آپ جیپ میں بیٹھے ہی مشق ناز فرماتے ہیں اور وہ پکیر و فایکے بعد دیگرے خونِ دو عالم اپنی گردن پر لیتے آپ کی جیپ کے ٹائرؤں میں ڈھیر ہوتے جاتے ہیں اور آپ کے اردلی اٹھا اٹھا کر دوسری جیپ میں ان کشتوں کے پستے لگا دیتے ہیں۔ ذرا آگے چل کر آپ دجلہ کے کنارے آنکلتے ہیں، تو ہزاروں تلیتر اور چکورا آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ایک ایک کر کے اس لیے نہیں بیٹھے کہ انہیں معلوم ہے آپ اناڑی ہیں اور ان بامروت پرندوں کو گوارا نہیں کہ آپ کا نشانہ خطا جائے۔

نتیجہ یہ کہ میس کے خیمے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کی میز پر غزالوں اور چکوروں کے روسٹ کا ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ اگرچہ میس سے نکلنے وقت یہ بلندی خاصی ہموار ہوجاتی تھی اور کبارہ کی سردی کا اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا سوائے اس آتش سیال کے جس کے خم براہ راست سکاٹ لینڈ سے کبارہ کے ویرانے میں لائے اور لندھائے جاتے تھے۔ برگیڈ کے افسروں میں صرف میں ہی مسلمان تھا اور جب کبھی وکی کا گلاس لینے سے انکار کرتا، میرے مے نوشن ساتھی ایک گہری ہمدردی کے عالم میں میری محرومی قسمت پر آہیں بھرنے لگتے۔ ایسی آہیں جو معلوم ہوتا تھا آسمان چیر کر نکل جائیں گی۔ جب ان صاف باطن رندوں کا کرب مجھ سے نہ دیکھا گیا، تو ایک روز جام وکی تھام ہی لیا۔ اس پر ان سرستوں نے اپنی شادمانی کے اظہار کے لیے میرے گرد اس قدر دیوانہ وار رقص کیا گویا فلک جھوم رہا ہو۔

ہمارے میس میں پینے کے لیے پانی کا استعمال اگر ناجائز نہ تھا تو مکروہ ضرور تھا۔
ایک دوپہر کو کیٹین ولسن باہر سے تھکا ہوا آیا، تو بے چہرہ سے ایک تازہ پانی کا گلاس بھرا لیا
اور صاحب کو پیش کیا۔ ولسن نے پانی دیکھا تو ایک وحشت کے عالم میں چلایا۔

”بندہ خدا مجھے کچھ پینے کو دو۔ میں وضو کرنے نہیں آیا۔“

میس سے باہر ہماری گفتار اور حرکات پر مٹلر، توپ اور تفنگ چھائے ہوئے تھے،
لیکن میس کے اندر ان چیزوں کا گزرنہ تھا۔ وہاں موضوع گفتگو فقط ایک تھا: عورت! اور
کس باریکی اور بیباکی سے اس موضوع کو گریدا جاتا تھا! پہلے دن یہ گفتگو سنی تو محسوس ہوا کہ
چند دن اور اسی معصیت کی زندگی کے گزارے تو ہم پر بہشت کے دروازے بند ہو جائیں گے
لیکن رفتہ رفتہ کچھ ایسے عادی ہو گئے کہ نہ صرف احساس گناہ جاتا رہا، بلکہ یہ احساس بھی ہونے
لگا کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ پھر زلف یار کی باتیں فقط تحت اللفظ ہی نہ ہوتیں، بلکہ نہایت

مرصع انگریزی گانوں میں بھی۔ انگریز نہایت دیانت داری سے انہیں DIRTY SONGS
(گندے گانے) کہتے ہیں اور غیر مطبوعہ انگریزی لٹریچر میں جتنا ذخیرہ اس صنف سخن کا ہے
وہ پاکیزہ گانوں کا نہیں۔ پھر انگریز بلکہ تمام یورپی اقوام کو رس میں گانے کی عادی ہیں اور جس
طرح کورس کی گونج مطالب سخن کو جلا دیتی ہے اور گانے والے کے دل و دماغ کو گرماتی
ہے وہ سولویا اکیلے گانے میں پیدا نہیں ہوتی۔ جو لوگ ان دنوں عراق میں تھے انہیں ایک
کورس یاد ہو گا جس کی آواز اکثر افسروں کے میسوں سے سنانی دیتی تھی۔

THERE IS SHORTAGE OF GOOD WOMEN IN ERBIEL

○ یاد رہے کہ یہ ایک طرح کی جنگی رعایت تھی، ورنہ امن کے زمانے میں میس کی میز پر عورت کا
کا ذکر فوجی آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

● لفظی ترجمہ ”اربیل میں اچھی عورتوں کا توڑا ہے“ اربیل عراق کا ایک شہر ہے۔

ہماری تہذیب میں کورس کے جملہ حقوق کم و بیش توالی کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں،
 اور ظاہر ہے کہ میسوں کا ہلکا پھلکا ماحول توالی کی طہارت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ جنگ
 کے آخری سالوں میں جب دیسی افسروں کی تعداد بڑھنے لگی تو ہم نے بھی محض انگریزوں کو
 جواب دینے کی خاطر چیدنیم غلیظ دیسی گانوں کو کورس کی شکل میں میسوں میں پیش کیا۔ مثلاً
 ”شہر کی لونڈیا“ اور ”چھٹی“ وغیرہ لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو انگریزی کورس کا خاصہ ہے۔
 برگید میس میں نئے نئے پنچے اور انگریز افسروں کو باہم باتیں کرتے سنا، تو ہمیں
 اچانک احساس ہوا کہ ہم تو انگریزی میں کورسے ہیں۔ ہمیں بھرتی ہونے سے پہلے ناز تھا کہ ہم
 نے شیلے اور ملٹن پڑھ رکھا ہے اور یہ کہ اور نہیں تو ہم TABLE TALK میں نمبر
 لیں گے، لیکن میز پر بیٹھے تو ہماری ساری ٹاک ہوا ہو گئی۔ ان لوگوں سے بات کرنے یا سمجھنے
 میں شیلے دانی یا ملٹن فہمی کا کچھ استعمال ہی نہ تھا۔ بے تکلف مردانہ محفلوں میں انگریزوں کی
 بول چال چٹ پٹے محاوروں اور رخسہ اور کرارے بلکہ فحش اور عریاں الفاظ سے مرکب ہوتی
 ہے۔ ان الفاظ پر درسی کتابوں اور ڈکشنریوں کے دروازے بند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انگریزی
 ہمارے استادوں اور سکولوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ فقط اہل زبان کے آگے گوش ادب دلانے
 سے ہی حاصل ہو سکتی ہے؛ چنانچہ ہر شب جب ہم میس سے اپنے خیمے کو لوٹتے تو دو صفحے نئے
 الفاظ کے رقم کر لیتے اور اگلے روز ذرا سمے سمے ان کے استعمال پر بھی طبع آزمائی کرتے۔ اس
 فن میں سنجگی کے لیے بڑی ریاضت درکار ہے۔ بہر حال ہمیں اپنی لغت پر مکمل عبور تو نہ حاصل
 ہو سکا، لیکن گزارا اچھا خاصا ہونے لگا۔ اب کہ انگریز جا چکا ہے یہ الفاظ کی استعمال کی وجہ
 سے زنگ آؤد ہو گئے ہیں اور جب تک کسی سے لڑائی نہ ہو زبان پر نہیں آتے۔

کیارہ کے برگید میس کی روداد نپولین اور بوجم کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگی۔ نپولین
 ہمارے میس کا ہیڈ ویٹر تھا۔ یہ ایک عراقی عیسائی تھا۔ نام تو کچھ اور تھا، لیکن قد و قامت اور

شکل کے اعتبار سے بالکل نیولین لگتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کشتی نما ٹوپی بھی پہن لیتا، تو ہمیں شک ہونے لگتا کہ کہیں سینٹ بلینا تو نہیں پہنچ گئے۔ اسی وجہ سے کسی خوش مذاق افسر نے اُسے نیولین کہنا شروع کر دیا تھا، لیکن اب وہ سچ مچ نیولین ہی بن بیٹھا تھا اور اصلی نیولین کے متعلق کہا کرتا تھا کہ ہاں، اس نام کا ایک اور شخص بھی گُزرا ہے۔ اگر کبھی بونا پارٹ کہہ کر بلاتے تو وہ اور زیادہ اطمینان محسوس کرتا اور ذرا اجنبیت نہ دکھاتا کہ اس طرح فرانسیسی خاندان سے رشتہ اور پکا ہو جاتا تھا۔

خوردوش کی دُنیا میں کوئی معرکہ ایسا نہ ہو گا جسے ہمارے نیولین نے محض اشارے سے سر نہ کیا ہو۔ اپنے ماتحت بیروں پر خالص جنگی انداز میں کمان کرتا، لیکن آخر اُسے بھی ایک دن اپنے واٹر لو کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بھی ایک بے بان بلکہ بے جان سے مدراسی کے ہاتھوں — یہ غریب مسالچی بھرتی ہوا تھا اور قسمت اُسے مدراس کے کسی دُور افاد گاؤں سے سیدھی ہمارے برگڈ میس میں لے آئی تھی۔ اس کا اپنا نام تو کچھ انگلم منگلم ہی تھا، لیکن اُسے بوجھ کہہ کر پکارتے تھے جو ایک فلم میں گونگے کردار کا نام تھا۔ ویسے بوجھ گونگنا تھا۔ فقط ضبط نفس کا قائل تھا یعنی بول سکتا تھا، لیکن بولتا نہ تھا۔ وہ ہر سوال کا جواب ایک شرمیلی سی مسکراہٹ سے دیتا تھا۔ ادھر نیولین کو یہ توقع تھی کہ اُس کے اشارے پر گورنر جھک جائیں اور میز پر پلٹیں چُھنے لگیں۔ بھلا مسکراہٹ سے اُس کی کیا تسکین ہوتی؟

ایک رات جب بوجھ کی مسکراہٹ سے پلٹیوں میں کوئی جھنش پیدا نہ ہوئی اور ڈز لیٹ ہونے لگا، تو نیولین کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ بھرا، گرجا اور برسائے یعنی آنا فانا بوجھ سے گتھم گتھا ہو گیا اور اُسے آن واحد میں پیوندِ خاک کر ڈالا۔ نیولین منہ پر جھاگ لاتا اٹھا، تو تھوڑی دیر بعد بوجھ بھی اپنی ہڈیوں کو ٹوٹنا اور جوڑنا، دل و جگر کو تھامنا، گریسوں کا سہارا لیتا اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے ہی نیولین کو ایسی دل گداز مسکراہٹ پیش کی کہ اس فاتحِ اعظم کا پتہ پانی

ہو گیا اور اس نے غیر مشروط طور پر بوجم کے آگے ہتھیار ڈال دیے، بلکہ بوجم کو سینے سے لگایا اور اُسے ایک پیار بھرا نام دیا۔ ”گرموشہ“ (خدا جانے اس کے کیا معنی تھے یا ہیں)، اس پر بوجم نے ایک اور واضح تبسم کیا۔ اس کے بعد بوجم کا واحد کام میس کے ایک کونے میں کھڑا ہو کر مسکراتا تھا۔ برگید کمانڈر صاحب کا کہنا تھا کہ برگید افسروں کے مورال کی تعمیر میں بوجم کی مسکراہٹوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

ہمارے برگید کا سگنل سیکشن جس کا کیپٹن شام کمانڈر تھا اور میں نائب کمانڈر تمام تر سیکھوں پر مشتمل تھا اور اس کا کام برگید کے نظام مواصلات کو قائم رکھنا تھا۔ یہ کسی قدر فخر سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے سیکھ جو انوں نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا؛ البتہ اُس شب کی قسم نہیں دی جاسکتی جب رَم (RUM) تقسیم ہوتی تھی۔ اُس رات سلسلہ مواصلات درہم برہم تو کیا، سرے سے ہوتا ہی نہ تھا۔ ٹیلیفون خاموش! واٹر لیس مہربلب!! اور ایکس چینج انگشت بندنا۔ رَم نوشی کے بعد ہمارے سیکھ جو انوں کو ان فرنگی کھلونوں سے کھیلنے کا دماغ نہ رہتا تھا۔ اُن کا قرار جان تو اُس ڈھولک اور چمپے کی آواز میں ہوتا جس کی تال پر وہ جھومتے، ناچتے اور پھر دفعۃً ایک ہنگامہ خیز سی آواز اٹھتی جو سارے کیمپ کو محیط کر لیتی۔

”تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لئے

..... اوبلے بلے۔ بلے بلے۔ بلے۔“

اور لمحہ بھر کے لیے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم صحرائے کبارہ میں نہیں، نا جھے میں بیٹھے ہیں۔

فوج میں ہر افسر کی خدمت کے لیے ایک سپاہی مقرر ہوتا ہے جسے بریٹ مین (BATMAN) کہتے ہیں۔ ہمیں سگنل مین ہر بنس سنگھ ملا۔ پہلی نگاہ پر لباس کے لحاظ سے

○ شراب کی ایک قسم

کچھ ڈھیلا سا نظر آیا۔ دو چار دن کام کر چکا، تو پتہ چلا کہ آپ کے دماغ کے کل پُرزے بھی کچھ ایسے کئے ہوئے نہیں۔ غالباً ہماری خدمت کے لیے اسی وجہ سے چُنے گئے تھے کہ کسی فوجی استعمال کے قابل نہ تھے۔ ہر بنس سنگھ کی خدمات سے صرف تین دن ہی استفادہ کیا تھا کہ ایک شام آہ و بکا کرتا تیز تیز میرے پاس آیا اور گرم آنسوؤں اور سرد آہوں کے درمیان میرے سامنے ایک تار رکھ دیا۔ مضمون تھا :

YOUR FATHER HOPELESS COME SOON

مجھے تو اس دیسی انگریزی کا مطلب سمجھ آ گیا یعنی ”تمہارے باپ کی حالت نازک ہے۔ جلد پہنچو۔“ لیکن ایک انگریز کی نگاہ میں یہ بنتا تھا کہ ”تمہارا باپ بالکل بیکار ہے، جلد پہنچو۔“ میں ہر بنس سنگھ کو لے کر کیپٹن شاء کے پاس گیا۔ کیپٹن شاء نے تار پڑھا، تو سفید کاغذ پر جواب لکھ کر میرے حوالے کیا کہ اس کے باپ کو بھیج دو۔ جواب یہ تھا :

YOUR SON EQUALLY HOPELESS NOT COMING

”تمہارا بیٹا بھی اتنا ہی بیکار ہے نہیں آسکتا۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الحمد لله رب العالمین
والصلاة والسلام على
سيدنا محمد وآله الطيبين
الطاهرين

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الحمد لله رب العالمین
والصلاة والسلام على
سيدنا محمد وآله الطيبين
الطاهرين

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الحمد لله رب العالمین
والصلاة والسلام على
سيدنا محمد وآله الطيبين
الطاهرين

نیم لفظین بغداد میں

اگر فرمودہ اقبال درست ہے کہ ”وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ“ تو یقیناً کیا رہ کی کائنات سے بے رنگ تر کوئی جگہ نہ ہوگی۔ کیونکہ وہاں سے نزدیک ترین نکل کا محل وقوع کوئی سو میل کے فاصلے پر تھا، یعنی بغداد میں۔ درمیان میں سرسبز ایک خاص مزارع صحرا تھا؛ لہذا اگر ہمارے برگید کے افسر اپنے دل کی سپاٹ خاکی دنیا میں تھوڑا سا رنگ بھرنے کے لیے بغداد کی ڈیوٹی کے بہانے ڈھونڈتے یا ایجاد کرتے تو سراسر قابلِ معافی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ بغداد جانے کے لیے کوئی کارگر بہانہ تلاش کرنا جوئے شیر لانا تھا اور اگر یہ جوئے شیر از خود بہنے لگتی یعنی بغداد جانے کے لیے کوئی جائز سرکاری کام نکل آتا تو بیسیوں رضا کار خدمت کے لیے پیش ہو جاتے۔ خدمت تو ہم بھی پیش کرتے لیکن صرف اکیسویں رضا کار ہی تصور ہوتے۔ کیونکہ سب سے جونیئر اور نا تجربہ کار ہونے کی حیثیت سے برگید افسروں میں ہمیں برادرِ خرد ہی سمجھا جاتا تھا اور برادرِ خرد کے لیے ایرانیوں نے ایک محاورہ وضع کر کے غریب کا ہمیشہ کے لیے ستیا ناس کر دیا ہے؛ چنانچہ بغداد جانے کی خواہش کا اظہار کرتا تو ہر طرف سے آوازیں اٹھتیں :

”تمیز سیکھو چھوٹے میاں! اس عمر میں تمہارے لیے بغداد کی سیر موزوں نہیں ہے۔“

ایک دفعہ کسی قدر بے حیائی سے کہہ بھی دیا کہ نہ صرف مزدوں بلکہ سخت ضروری ہے، لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ اب کون تاریخ پیدائش نکلو کر ثابت کرتا پھر تاکہ ہماری شیر خوارگی کا زمانہ گزرے مدتیں ہو چکی تھیں؛ چنانچہ ایک عرصے تک اپنے پہلو میں درود دل دباٹے بیٹھا کیے تا آنکہ ایک روز خود قدرت کو ہماری خاطر ایک ترکیب سوجھی۔

ہوا یہ کہ ہمارے برگڈیٹر صاحب کو عربی سیکھنے کا شوق چرایا اور فی الفور ایک عراقی ٹیوٹر منگایا گیا۔ ٹیوٹر نے اپنے گزشتہ تجربے کی بنا پر برگڈیٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر عربی سیکھنے میں آپ کا ایک اور ساتھی بھی ہو تو دونوں شاگردوں کا بھلا ہوگا۔ برگڈیٹر صاحب کے ہم جماعت ہونے کا قرضہ ہمارے نام پڑا۔ ایک سیکنڈ لفٹنٹ کے لیے ایک برگڈیٹر کا ہم سبق ہونے سے بڑی کوفت کیا ہو سکتی ہے؛ لیکن بر خردار جو تھے، دھر لیے گئے۔

خیر، جب تعلیم شروع ہوئی، تو برگڈیٹر صاحب بڑے مفید ہم جماعت نکلے معلوم ہوا کہ پانچ چھ یورپی زبانیں جانتے ہیں؛ بلکہ زبانیں سیکھنے کا انہیں چسکا ہے۔ آپ ایران کے مختصر سے قیام سے تھوڑی سی فارسی بھی چُن لائے تھے، لیکن عربی بول چال میں ابھی متعارف نہیں رہے تھے۔ ادھر ہم نے کالج میں صرف فارسی پڑھی تھی۔ عربی گورنر نہیں پڑھی تھی؛ تاہم باقی مسلمانوں کی طرح (یعنی ٹیڈی مسلمانوں کو چھوڑ کر) عربی پڑھنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور عربی لکھنا ہمارے دائیں ہاتھ کا اور دونوں ہاتھوں سے کوشش کر کے کچھ مطلب بھی نکال سکتے تھے؛ چنانچہ پہلے روز ہی جب عربی کتاب فر فر پڑھ ڈالی، تو برگڈیٹر صاحب حیران رہ گئے اور استاد محترم تو پھر تک ہی اُٹھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہماری عربی دانی کی وجہ ہماری مسلمانانہ ہے تو آپ نے خوش ہو کر حلق کی گہرائی سے ایک بل کھاتی ہوئی الحمد للہ نکالی۔ جو اب ہم نے بھی یرحمک اللہ پیش کی جو اپنے وطن میں تو چھینک مارنے کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن اس موقع پر بھی خاصی صفائی سے چپک گئی۔

احتیاطاً ہم نے ایک ہلکی سی مصنوعی چھینک بھی چھینک دی کہ ان مقدس تراکیب کے ٹیکنیکل استعمال کی صحت بھی برقرار رہے۔

باتوں باتوں میں برگیڈیئر صاحب ہم سے فارسی میں سوال کر بیٹھے۔ ہمارے منہ سے محض اتفاقاً ایک چست سا جواب نکل گیا۔ برگیڈیئر صاحب مرعوب ہو کر کہنے لگے:

”ارے تمہاری تو فارسی بھی بڑی ”مضبوط“ ہے۔ بغداد جا کر امتحان کیوں نہیں دیتے؟

پورے چھ سو روپے انعام ملے گا۔“

ظاہر ہے اس دعوت کے قبول کرنے میں تکلف کرنا بلوغت کشتی کے برابر تھا۔ ہم نے بعجلت تمام امتحان کے لیے درخواست لکھی۔ اپنے ہم جماعت سے تصدیق کرائی اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی۔ قصہ مختصر کوئی پندرہ دن بعد ہم رشید ٹریٹ بغداد میں ہوٹل قصر و جلد کے مہمان تھے۔

امتحان کی منزل آسان نکلی۔ انگریز ممتحن کے پہلے سوال کا ہی جواب دیا، تو غریب دونوں بازو بلند کر کے بولا: ”TOO GOOD“ گڈ تو ہم واجبی سے ہی تھے، لیکن یہاں سوال ہماری رائے کا نہ تھا، بلکہ ممتحن کی بصیرت کا تھا جس کی رُو سے ہمارا مقام مہ و پرویں کے قریب نکلا؛ چنانچہ فارسی زبان کے امتحان میں تو ہم پاس ہو گئے، لیکن بغداد کی زندگی کے امتحان میں کسی قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ سکول کے دنوں میں الف لیلہ پڑھی تھی، تو ہمارے تصور کا بغداد ایک خوابوں کی دنیا تھی۔ پراسرار و حیرت انگیز۔ جہاں علی بابے دبے پاؤں مٹکے اٹھائے پھر رہے ہوں، ابوالحسن سو جاگ رہے ہوں۔ نیم برہنہ حسین کینزیس رقص کر رہی ہو۔ ایک کونے میں اللہ دین چراغ رگڑ رہا ہو اور کانا حجام آستین میں دشنہ چھپائے گھات میں بیٹھا ہو، لیکن جو بغداد ہمارے سامنے تھا، اس میں کوئی اسرار تھے نہ رموز، علی بابا تھا نہ اللہ دین نئے اور الف لیلہ کے بغداد میں کوئی مماثلت ہی نہ تھی، سوائے نیم برہنہ رقا صاؤں کے جو آب اور

زیادہ برہنہ ہو گئی تھیں اور شاہی محلوں کی خلوت کی بجائے کٹ کیٹ کی جلوت میں ٹکٹ لگا کر ناچتی تھیں۔

کیارہ کی بے زن دنیا سے ہم اپنے اُجاڑ دل میں رنگ بھرنے آئے تھے وہ بھریا یایوں سمجھیے کہ بغداد نے بزور بھردیا۔ شارع الرشید کا وہ رواں دواں حُسن کہ شوخ بھی تھا اور بے حجاب بھی اور ہوٹل قصرِ جلدہ کی وہ رنگ و بو میں ڈوبی ہوئی شبینہ تقریبات کہ جہاں حُسن آمادہ ظہور ہی نہ تھا، ماٹل کرم بھی تھا — ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔

سر شام قصرِ جلدہ کے چمن میں ایک حسین و جمیل مخلوط مجمع میں ہم چند افسر اپنے مشروبات پر محو گفتگو تھے کیپٹن سٹمن و سکی کے زیر اثر اپنا ناپاک فلسفہ بیان کر رہے تھے کہ یہاں ہر عورت کی کچھ قیمت ہے اور ہم اس سونہن پر لعنت بھیج رہے تھے کہ باہر ٹرک پر ایک کیڈی لاک کارر کی۔ شو فر نے ادب سے دروازہ کھولا۔ اندر سے دو وجیہ اور باوقار خواتین برآمد ہوئیں۔ ہوٹل کے خادموں نے جھک کر سلام کیا۔ معلوم ہوتا تھا کسی بڑے گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔ چلیں، تو ایک واضح تمکنت اور شان سے۔ آخر ٹریس کی کونے والی میز پر جا بیٹھیں۔ ہم نے سٹمن سے کہا:

”اب کہو، تمہارا گستاخ کلیہ ان معزز خواتین پر بھی حاوی ہے؟“

بے لگام سٹمن کو بھی ہاں کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ ایک شکست خوردہ سامنے لے کر رہ گیا۔ ہم نے شور مچایا۔ ”ہار گئے۔ ہمیں DRINKS پلاؤ۔“ سٹمن نے سر تسلیم خم کیا۔ مزید مشروبات کا آرڈر دیا اور آرڈر دیتے ہوئے بیرے کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ بیرے نے جاتے ہوئے ان خواتین کا بھی آرڈر لیا اور کچھ دیر کے بعد گلاسوں سے بھری ہوئی ٹرے لے آیا۔ ہمارے سامنے گلاس رکھے، تو سٹمن کے سامنے گلاس کے علاوہ ایک کاغذ کا پُرزہ بھی رکھا جس پر زمانہ ہاتھ سے لکھا تھا: ”عشرہ دنانیر (دس دینار)!“

اب سٹن کا پہلا اور جائز مطالبہ یہ تھا کہ قطار باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور جھک کر سلام کرو۔ اس پر ہم نے خوشی اور خاموشی سے عمل کیا۔ اس کا دوسرا اور ذرا کم جائز مطالبہ یہ تھا کہ ہفتہ بھر اپنے پیسوں سے وِسکی پلاؤ۔ اس پر ہم نے نہایت باوازا خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن بہر حال عمل اس پر بھی کرنا پڑا۔

سو ہم چاہتے تو اپنی بلیک اینڈ وائٹ زندگی کو مکمل طور پر ٹیکنی کلر میں بدل دیتے، لیکن سچی بات ہے ہم میں اتنے شوخ رنگوں کی تاب نہ تھی اور بہر حال اس مال فروخت میں وہ کشش نہ تھی کہ ہم دولتِ دل مع ڈیلی الاؤنس ان کے آگے ڈھیر کر دیتے، لیکن یہ کہنا بھی ریاکاری ہوگی کہ ہم نے قصرِ جدہ کے حادثے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی اور قیامِ بعداؤ کے باقی ایام فقط یادِ خدا میں گزار دیے۔ ہمیں گزارشِ احوال واقعی منظور ہے اور وہ یوں ہے کہ ہمارے ایام بلکہ راتوں کا بیشتر حصہ کٹ کیٹ اور ”ملی الف لیلہ“ کے گرد پیش ہی گزرا جو وہاں کے مشہور کیرے تھے، اگرچہ وہاں بھی ہماری کشش کا مرکز اپنے وطنی افسروں کی صحبت تھی نہ کہ عربی رقص۔

رقص کے معاملے میں ہر ملک کا اپنا مذاق ہے۔ ہندو پاکستان میں رقص کے عناصر چشم و ابرو کے اشارے اور دست و پا کی حرکات ہیں اور جس قدر نزاکت ان چار عناصر میں ہو، رقص اتنا ہی دل فریب ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے عربی رقص کا پہلا لازمہ عریانی ہے اور دوسرا کولہوں اور چھاتیوں کی جنبش۔ عریانی جس قدر دُور رس اور جنبش جتنی طوفانی ہو رقص اتنا ہی لاثانی تصور ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے جب ایک عراقی رقصہ کو تقریباً پگڑوں کے بغیر دیکھا تو پدک سے گئے اور جب معاملہ جنبا نیدن تک پہنچا تو باور نہ آتا تھا کہ بھری مغل میں یوں بھی ہو سکتا ہے، لیکن ہوتا رہا اور ہم دیکھا کیے۔ پہلے ذرا کافی آنکھ سے، پھر جیسے کتاب پڑھی

○ روزانہ بھتہ

جاتی ہے اور وہ جسے ذوق سلیم کہتے ہیں، اس مذوجزر کی نذر ہو گیا جو ان رقاصاؤں کی سینہ زری سے پیدا ہو کر تماشائیوں کو لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ہمیں کٹ کیٹ اور ملی الف لیلہ میں وہ بات نہ ملی جو ہندوستان کے مسیماؤں میں تھی۔ ہمیں اپنے وطن کے رقص اور عربی رقص میں وہی فرق محسوس ہوا جو ستار نوازی اور ڈھول بجانے میں یا گلاب اور گوجھی کے پھول میں ہے، لیکن یہ ہمارا نقطہ نگاہ ہے۔ ممکن ہے عرب حضرات ہمارے لطیف اور رمزیہ رقص کو دیکھیں تو کہیں ”کیا وہ ایسا چیز ہے، نہ کو لہا ہلتا ہے، نہ چھاتی پھرتی ہے، یہ تو مسکین اور یتیمی کا رقص ہے۔“ مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا ہمارے دلوں میں پیدا ہونے والا احترام ہے، مگر ان ممالک میں جا کر یہ احترام ذرا ڈگمگانے لگتا ہے۔ اس میں قصور دراصل عربوں کا نہیں، ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے انہیں محض عرب ہونے کی وجہ سے تقدیس کی رُونی میں لپیٹ رکھا ہے اور ان سے سوائے اس کے توقع ہی نہیں رکھتے کہ صبح اٹھیں، وضو کریں اور دن بھر اذانیں دیتے رہیں یا نفل ادا کرتے رہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ عرب بھی ہماری طرح گوشت پرست کے انسان ہیں اور سینے میں دل رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً بھر بھی آتا ہے، بلکہ جغرافیائی مجبوریوں سے کچھ زیادہ ہی بھرا آتا ہے۔ گویا دل کے معاملات میں عرب بھائی بالکل ہماری طرح ہی بے بس ہیں اور ان سے محسوس نیکوں کی توقع صریح زیادتی ہے۔

البتہ ایک معاملے میں عرب ہم سے بہت آگے ہیں اور وہ ہے قرأت۔ عرب قاری کی آواز میں ایک جادو ہے اور نئے میں ایک سحر، ہم نے جب بھی عربوں کی زبان سے قرآن سنا، وجد میں آگئے۔ لیکن ایک معاملے میں عرب نہ صرف ہمیں وجد میں نہ لاسکے، بلکہ اٹا چکر میں ڈال دیا اور یہ تھا ان کا طریقہ نماز۔ ایک دفعہ جو کچھ ہم نے دیکھا وہ بظاہر تھی تو نماز ہی، لیکن عجیب فری سٹائل (FREE STYLE) کی عبادت تھی۔ عید کا دن تھا اور برادر عزیز صغیر

○ میجر سید اصغر حسین۔ آج کل کیپٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے شیرمالیات ہیں۔

مُصْر ہوئے کہ بصرہ مسجد میں جا کر نمازِ عید ادا کریں گے۔ پہلی مسجد کے دروازے پر پہنچے تو قفل پڑا تھا۔ خانہ خدا اور قفل؛ چلو۔ کوئی مصلحت ہوگی۔“ دوسری مسجد میں گئے۔ خیر سے کھلی تھی۔ وضو کر کے اندر داخل ہوئے۔ دیکھا کہ نمازِ عید باجماعت نہیں بلکہ فرداً فرداً پڑھی جا رہی ہے۔ حیران ہوئے لیکن کہا ”چلو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔“ یہ دیکھ کر البتہ خوشی ہوئی کہ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شریک نماز تھیں، لیکن اس کے بعد ہم نے کچھ ہوتے دیکھا اور اسے دیکھ کر ہماری خوشی پہلے حیرت اور پھر وحشت میں بدلنے لگی۔

ابھی ہم نے نماز شروع نہ کی تھی کہ ساتھ کے نمازی عین نماز کے درمیان سر بھیر کر نہایت بے تکلفی سے ہمیں تکنے لگے۔ کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اصغر کو اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھتے جا رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ہم سے خیریت مزاج بھی پوچھتے ہیں، لیکن شاید ”آمین“ تک پہنچ گئے تھے۔ اچانک منہ خانہ کعبہ کی طرف کر کے رکوع میں چلے گئے۔ میں ابھی اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اصغر بولے: ”ادھر دیکھنا۔“ اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھی سی خاتون نے جو التحیات میں ہیں، دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ایک گنگنا سگرٹ تھام رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً نہایت تسلی بخش ساکش لگا لیتی ہیں اور خانہ خدا میں نیلے دھوئیں کے مرغولے اور محرابیں تعمیر کر رہی ہیں۔ حیران تھے لیکن کیا کہہ سکتے تھے سوائے اس کے کہ یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر

نماز پڑھی اور باہر آگئے۔

ذکر بغداد کی تفریحات کا تھا۔ زمانہ جنگ میں اخلاق کے بندھن کسی قدر ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور بغداد کا ماحول بھی اخلاقی صحت کے لیے ایسا سازگار نہ تھا، بلکہ دل و نظر کا سفینہ سنبھالنے کے لیے خاصی کوشش کرنا پڑتی تھی۔ ایک ایسی ہی کوشش ہمیں بغداد سے نکال کر نجف کو کر بلائے گئی۔ ہوٹل میں ساتھ کے کمرے میں ایک اور سینڈ لفٹنٹ پٹھرے ہوئے

تھے۔ وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ کربلا پہنچے تو معلمین نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مختلف مقامات دکھائے۔ ہم دونوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ فوراً باقی زائرین خصوصاً بچوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ جدھر جاتے، ایک چھوٹی سی فوج تعاقب میں ہوتی۔ معلم نے انہیں بھگانا چاہا، لیکن انہوں نے یک زبان ہو کر کچھ عربی آوازیں نکالیں۔ ہمیں ڈرتھا کہ کہیں یہ عربی میں لاہوری ”اٹے اٹے“ کا ہم معنی کورس نہ شروع کر دیں۔ معلم کو ٹوک دیا اور تعاقب کندگان سے مصنوعی خندہ پشیمانی سے اشارے کیے۔

بالآخر حضرت امام حسینؑ کے روضے میں داخل ہوئے جہاں نہ صرف ان لوٹوں سے امان ملی بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے تمام ذہنی و روحانی آلائشوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ فاتحہ پڑھی اور دیر تک مقبرے کی جالی تھامے کھڑے رہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آنکھیں تر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

کربلا سے نجف پہنچے۔ یہاں کا ماحول کسی قدر مختلف تھا۔ یہاں ہندوستانی مسلمان خاصی تعداد میں تھے، مگر اکثر غریب اور نادار۔ روضے سے ایک فاصلے پر ٹیکی سے اترے، فوراً ایک ہم وطن ہماری طرف بڑھے اور میرے ساتھی کو جمعدار صاحب کہہ کر سلام کیا۔ اپنی لفظی کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں مسمار ہوتے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غریب کو بازو سے پکڑ کر کہنے لگے:

”او بھک منگے! تو نے بیک جنبش لب مجھ فل سیکند لفظنت کو جمعدار بنا دیا تمہاری یہ مجال؟“ اس کے بعد آپ نے اُسے غلط انگریزی میں چند گالیاں دیں جسے اُس نے صحیح سمجھ کر بُرا مانا کہ لفظین صاحب کی نیت بہر حال صحیح گالیوں کی تھی۔

حقیقت میں سائل بیچارے کا قصور نہ تھا کہ اُن دنوں جمعداروں اور لفظینوں کے کندھے کے نشانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں ایک سے پتیل کے ستارے لگاتے تھے

اور آج کل کا امتیازی فیتہ مہمداروں کو نہ بلا تھا؛ چنانچہ لفٹین صاحب کو بہت سمجھایا، لیکن نہ مانے کہنے لگے:

”جمہدار پگڑی باندھتا ہے، میرے سرفرانڈ ٹوپی ہے۔ کیا یہ اندھا ہے؟ پگڑی اور ٹوپی میں تمیز نہیں کر سکتا؟“

ذرا ہنس کر عرض کیا: ”معاف کر دیں غریب کو، ذرا بھینگا ہے شاید OPTICAL ILLUSION کی وجہ سے غلطی کر گیا ہے۔“

بولے: ”گویا تم بھی سائنس کی مدد سے میری ہتک کرتے ہو۔“

اب معلوم ہوا کہ قبلہ لفٹین صاحب بھی ذرا دماغ کے بھینگے ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا اور آگے روڑنے کی جانب بڑھے، لیکن دفعۃً لفٹین صاحب رُک گئے اور کہنے لگے:

”امیر المؤمنین کے روڑنے میں جانے سے پہلے خیرات بانٹنی لازم ہے۔“

آپ سید تھے۔ میں سمجھا ان رموز سے واقف ہیں چلو انہیں خیرات بانٹنے دو آپ نے جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا اور اپنی ہندوستانی زبان سے عرب ڈرائیور کو انگریزی میں حکم دیا کہ اس کی ریزگاری لے آؤ، تاکہ غرباء میں تقسیم کر دی جائے۔ ڈرائیور نے دل میں ہندوستانی انگریزی کا عربی ترجمہ کر کے سمجھا کہ اسے خود ہی دینار بھنا کر غرباء میں تقسیم کرنا ہے۔ غرباء کی وہاں کوئی کمی نہ تھی۔ ڈرائیور پانچ منٹ میں اس کا رخیر سے فارغ ہو کر آ گیا۔ لفٹین صاحب بولے:

”اُچکے کہیں کے، ہمارے ساتھ دھوکا؟ جاؤ جن جن غریبوں کو خیرات دی ہے، اُن سے واپس لاؤ۔ ہم اپنے ہاتھ سے بانٹیں گے۔“

ڈرائیور سمجھ گیا، سواری عقل سے عاری ہے۔ جیب سے ایک دینار کا نوٹ نکالا اپنے

○ فریب نظر

سر پر پھیرا اور چوم کر قبلہ لفٹین صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لفٹین صاحب کے شور و غل سے بھکاری تماشے کی خاطر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس گماگھی نے خیرات کو تقسیم انعامات کی تقریب بنا دیا۔ آخری پیسہ ختم ہو چکا، تو جناب نے خطبہٴ صدارت دینا چاہا، لیکن خوش قسمتی سے بھکاریوں نے اس میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور جب سامعین میں فقط یہ خاکسار اور ڈرائیور رہ گئے، تو شاہ صاحب نے ہمیں روضے کی زیارت کی اجازت بخش دی۔

الغرض جب واپس بغداد پہنچے، تو آدھی رات کا عالم تھا۔ لفٹین صاحب نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے تجویز فرمایا کہ کل کا ظہین کی زیارت کی جائے۔ ارادہ تو ہمارا بھی تھا، لیکن اُن کی رفاقت کا شوق سرد ہو گیا تھا؛ لہذا ہمرکابی سے عذر کر دیا۔ دوسرے روز کا ظہین پہنچے تو آگے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ معلوم ہوا دو آدمی گتھم گتھا ہیں۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو فریقین میں سے ایک ہمارے لفٹین صاحب ہی تھے۔ اس کے بعد ان لفٹین صاحب کو آج تک نہیں دیکھا۔ حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے۔ شاید ادھر ہی ہوں۔ بہر حال جہاں ہوں خدا انہیں خوش رکھے۔ اگرچہ اس معاملے میں وہ خدا سے تعاون کرنے والے نہ تھے۔

آخر ہمارا بغداد کا قیام ختم ہوا۔ واپس کیا رہ پہنچے، تو برگیڈ موصل کو کوچ کر رہا تھا جو پچاس میل شمال میں تھا۔ گویا پچاس میل اور ہٹلر کے قریب۔ اس نقل مکانی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شمال سے ہٹلر بھی اسی قدر ہماری جانب بڑھنے کی زحمت اٹھا رہے ہیں اور چونکہ ملاقات کا امکان سا ہے لہذا معزز ہمان کو چند قدم بڑھ کر ملنا لازم ہے۔

موصل پہنچے تو آفیسرز میس اور چند سینئر افسروں کے لیے موصل شہر میں عمارت مل گئی۔ باقی سپاہیوں اور ہم جو نیئر افسروں نے شہر سے چند میل باہر خیمے گاڑے۔ انداز یہ ہوتا تھا کہ جتنی جگہ خیمہ گھیرتا ہے اُسے دو تین فٹ گہرا کھود دیا جاتا تھا۔ اس سے ایک تو

گہرائی کے سبب خیمے کے اندر چلنا پھرنا آسان ہو جاتا تھا اور دوسرے اندر بیٹھے یا لیٹے ہوئے دشمن کی گولی کارگر نہ ہوتی تھی۔ دن بھر سپاہیوں کے ساتھ کام کرتے، لیکن کھانے کا وقت اور خصوصاً شام میں گزارتے یا موصل کی گشت کرتے جہاں وہی بصرہ و بغداد کے رنگ تھے، لیکن ذرا کم شوخ۔ رات بہر حال کیمپ میں آجاتے۔

ایک رات اس زور کی بارش ہوئی کہ قبول شخصے سات آسمان گر پڑے۔ ذرا بادل چھٹے تو رات کے دو بجے کیچڑ سے لت پت میں سے کیمپ پہنچے۔ آگے خلاف معمول ہمارا اردلی سگنل مین ہر بنس سنگھ انتظار کر رہا تھا۔ غریب ہڈیوں تک بارش سے بھیگ چکا تھا اور اچھا خاصا چراپو نجی بنا کھڑا تھا۔

میں نے پوچھا: ”اتنی رات گئے انتظار کی ضرورت؟“

بولا: ”صاحب، وہ گم ہو گیا ہے۔“

”کیا گم ہو گیا ہے؟“

”آپ کا تنبو، جی!“

”تنبو کیسے گم ہو سکتا ہے؟“

”جی اڑ گیا ہے۔ طوفان جو آیا تھا۔“

”اور ہمارا سامان؟“

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”یعنی؟“

”خیمے کا گڑھا پانی سے بھر گیا ہے اور زمین کے ساتھ ہموار ہو گیا ہے۔ صبح ڈوبی

لگا کر دیکھوں گا۔“

”جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تم کیا کر رہے تھے؟“

”جی، میں دیکھ رہا تھا۔“

ہر بنس سنگھ اس ”دیکھتے رہنے“ کی وجہ سے اپنے آپ کو شاباش کا مستحق سمجھتا تھا۔ اُسے شاباش دی اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ رات واپس میں جا کر ادھار کے بستر پر گزاری۔ صبح کیمپ میں آئے، تو ہر بنس سنگھ لنگوٹے میں ملبوس مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور بولا:

”صاحب، آپ کی لوہے کی کرسی خیمے کے گڑھے میں سے بل گئی ہے۔“

میں نے کہا: ”شاباش، اور باقی سامان؟“

ہر بنس سنگھ کی مسکراہٹ ذرا کھلانے لگی۔ بولا: ”صاحب، باقی سامان تو دُبلے

میں پہنچ گیا ہے۔“

موصل سے طبرقہ پنڈر سوہیل کا سفر

ہماری نگاہیں موصل کے شمال میں کاکیشیا کے پہاڑوں پر جمی تھیں کیونکہ اسی راستے سے ہٹلر کی آمد کی خبر گرم تھی اور استقبال میں ہمارے برگیڈ نے گھر کے تمام بورے بچھا رکھے تھے یعنی جس حد تک ایک برگیڈ کی بساط تھی، بازی لگادی تھی۔ ادھر ہٹلر کا لشکر کئی ڈویژنوں پر مشتمل تھا اور کہا جاتا تھا کہ اگر وہ ستر گرا دھرا نکلا، تو ہمارے برگیڈ کے پُرزے اڑیں گے۔ ہم اس کے لیے بھی تیار تھے، لیکن بالآخر یہ تماشنا ہو اور ہوایہ کہ عین اس وقت کہ ہم ہٹلر کی خنجر آزمائی کے لیے موصل کے نواح میں مقتل آراستہ کر رہے تھے اُس کی نگاہ رُوس کے کفن بدوشوں پر پڑی اور ظالم نے اُن کے مقابلے میں ہمیں قابلِ التفات نہ سمجھا۔

وا حسرتاً! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ

ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

اب ہم اس خیال سے نڈھال ہونے لگے کہ شاید موصل میں ہی بیٹھے بیٹھے بے مصرف بوڑھے ہو جائیں گے اور سوچ ہی رہے تھے کہ اب کہاں قسمت آزمانے جائیں کہ اچانک شمالی افریقہ کے صحرائے اعظم سے ایک نئے خنجر آزمائی یعنی جنرل رومل نے ہمیں

○ صحرائے افریقہ میں لڑنے والی جرمن افواج کا نامور جنرل

یا دیکھا۔ اُس وقت رومل مغرب سے مصر کی طرف بڑھ رہا تھا اور بن غازی کی گوشمالی اور پھر اشک شونی کرتا ہوا اپنی دُور مار توپوں کے ذریعے طبرق کی ابتدائی مزاح پُرسی کر رہا تھا، لیکن پیشتر اس کے کہ اہل طبرق کوئی مناسب جواب دینے کی ہمت کر سکتے، ہمارے برگید کو حکم ہوا کہ موصل سے طبرق پہنچو، یعنی کوئی ڈیڑھ ہزار میل مغرب کو؛ چنانچہ فی الفور ایک طویل سفر کی تیاری ہونے لگی۔

نقشہ دیکھا، تو معلوم ہوا کہ موصل سے فلسطین کے ساحل تک پائپ لائن ہماری فریق سفر ہوگی اور اس سے آگے نہر سویز کے پار افریقہ کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ ساحلی سڑک۔ گویا تمام تر راستہ صحرا سے گزرتا تھا اور اس طویل صحراوردی کے انجام پر کوئی ایسا نہ تھی بلکہ رومل!

۵ مئی ۱۹۴۲ء کو موصل سے کوچ کیا اور جنوب میں بغداد سے سترہ میل ادھر نیچی کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔ یہاں ہفتہ بھر ٹھہر کر بغداد سے نیا ساز و سامان اور اسلحہ و بارود حاصل کیا اور سفر طبرق کی تیاری کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سفر آخرت کی تیاری ہے کیونکہ رومل سے کسی بہتر سلوک کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال ۲۲ مئی کو ہمارا ۱۲ روزہ صحرائی سفر شروع ہوا اور علی الصبح برگید کی سینکڑوں مختلف النسل گاڑیاں جو انوں اور سامان سے لدی ہوئی ایک خاص ترتیب سے سڑک پر نکلیں اور کارواں مغرب کو روانہ ہوا۔

کارواں میں سفر کرنے کے آداب خاصے کڑے ہوتے ہیں۔ گاڑیوں کی رفتار اور ان کے درمیانی فاصلے مقرر ہوتے ہیں۔ کیا مجال جو کوئی ڈرائیور تیز مزاجی میں اپنے پیش رو سے آگے نکل سکے؟ کوئی یہ غلطی کرے، تو بالیقین اُس کے پر جل جانے کا اندیشہ ہے کہ امیر کارواں میں نہیں ٹوٹے و لنوازی! اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ اگر وہ ہر کارواں شکن کی و لنوازی کرتا پھرے، تو پھر کارواں کا اللہ حافظ! اور ایسے بگڑے ہوئے

کاروانوں کی حفاظت اللہ کی عادت نہیں۔ کارواں سے ٹوٹنے کا فقط ایک ہی جائز بہانہ ہے کہ چلتے چلتے آپ کی گاڑی کا انجن جان بچی ہو جائے، لیکن ایسے انجنوں کا میسج بھی کارواں کے ساتھ ہی چل رہا ہوتا ہے۔ اُسے غیر دینی زبان میں بریک ڈاؤن لاری کہتے ہیں۔ اور اس کی ایک پھونک مردہ انجن کو صبار فناری پر آمادہ کر دیتی ہے اور اگر پھونک کار گرنے ہو تو نہ سہی، مگر عاشق یوں بھی بے معنی چیز ہے اور اس میسج کو اپنی بات جانے سے کوئی خفت بھی نہیں ہوتی۔ مرحوم کو سربراہ چھوڑتے ہوئے باقی کارواں مع میسج کارواں رہتا ہے۔

کوئی چار بجے کا وقت تھا کہ ہمارا کارواں مجورا کے مقام پر رات کے قیام کے لیے رُکا۔ مجور کیا بلا تھی، ہمیں نظر نہ آئی۔ لت و دق صحرا تھا۔ دشمن کے ہوائی جہازوں کا ایسا خطرہ تو نہ تھا، لیکن کارواں سالار نے مورچے کھودنے کا حکم دے دیا اور کھلے میدان میں سگریٹ پینے یا روشنی کرنے پر پابندی لگادی۔ زندگی تلخ کرنے کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی پابندیاں بڑی پابندیوں سے کہیں زیادہ ظالم ہوتی ہیں۔ بہر حال جائے اعتراض نہ تھی۔ دن کا کھانا ہم نے چلتی گاڑیوں میں ہی کھایا تھا، لیکن اب باقاعدہ میس کا خیمہ نصب ہوا۔ میزیں لگائی گئیں، انگریزی دستور کے مطابق کھانا چنا اور کھایا گیا اور مشروبات نوش کیے گئے۔ فوجی زندگی کا یہ قرینہ بے حد دلکش ہے۔ اس زندگی میں جھاکشی بھی قیامت کی ہے، لیکن ان جھاؤں کے درمیان اگر ایک لمحہ فرصت کا میسر ہو یا دشمن مُہلت دے، تو بزمِ طرب آراستہ ہو جاتی ہے۔ یہ لکھتے ہوئے برگئیڈیئر فینڈلے FINDLEY کا واقعہ یاد آتا ہے۔ قبائلی علاقے کے سلسلہ کوہستان میں فوجی مشقیں کر رہے تھے کہ چاروں چار ایک رات پہاڑ کی دندانے دار ڈھلان پر گزارنا پڑی۔ خیال تھا کہ یونہی کسی چٹان سے ٹیک لگا کر شبِ سحر کر دیں گے کہ برگئیڈیئر فینڈلے کو اپنا بستر اپنے ہاتھ سے کھولتے ہوئے دیکھا اور بید حیرت ہوئی، کیونکہ برگئیڈیئر صاحب

صرف تین چوتھائی اصلی تھے اور باقی مصنوعی یعنی آپ کی ایک ٹانگ اور بازو چوبی تھے۔ اصلی اعضاء ایک جنگی حادثے میں ضائع ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے آپ نے پہلے چارپائی کے برابر جگہ مہوار کی، پھر سفری پلنگ لگایا، بستر بچھایا، سفری میز اور کرسی نکالی۔ میز پر بیئر کی بوتل اور گلاس رکھے اور ایک سکون کے عالم میں نئے نوشتی شروع کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے سامنے ایک ٹوٹے پھوٹے برگئیڈیئر کی بجائے کوئی جوان سال شاعر بیٹھا ہے جس نے انتہائی سنگلاخ زمین میں ایک سنگتہ غزل کہہ ڈالی ہے۔

جب برگئیڈیئر صاحب نے ہمیں دیکھا کہ سوالیہ نشان بنے بیٹھے ہیں، تو ہنسنے اور کہنے لگے:

○ ANY FOOL CAN MAKE HIMSELF UNCOMFORTABLE

برگئیڈیئر صاحب کی چوٹ سے ہمارے سالم دست و پا حرکت میں آگئے اور منٹوں میں پہاڑ کی ڈھلان پنڈی کلب کی طرح آراستہ ہو گئی۔
کہا جاتا ہے کہ

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

لیکن حقیقت میں شرط منعم ہونا نہیں بلکہ ایک خاص ذہنی کیفیت کی ضرورت ہے اور زندگی سے بہرہ رنگ لطف اندوز ہونے کا ذوق ہے ورنہ فوجی بے چارے کہاں کے منعم ہیں؟

رات آرام سے گزارنی اور صبح سویرے پھر رٹک پر تھے۔ رٹک سے آپال لاہور کی قسم کی کوئی چیز تصور نہ کر لیں جسے پی ڈبلیو ڈی نے اپنے صدری نسخوں سے سجایا بنایا ہو۔
○ کوئی بے وقوف بھی بے آرامی سے بسر کر سکتا ہے۔

بلکہ ہمارے سامنے عراق کا وسیع صحرا تھا جس کی مغربی حد فلسطین سے جا ملتی تھی اور یہ شاہراہ
 سینہ صحرا پر لاریوں کی متواتر آمد و رفت سے خود روسی سڑک بن گئی تھی جو "ٹارمیک" نہ سہی
 پہنچگی اور ہوماری میں مال سے ٹکر کھاتی تھی اور کشادگی میں تو طرف تنگنائے مال کا اس سے
 کچھ مقابلہ ہی نہ تھا۔ سڑک کی وسعت صحرا کی وسعت کے برابر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر ایک
 مقررہ سمت میں سفر کرنے کے لیے دن کی روشنی درکار تھی۔ رات کے مسافر اس کی کشادگی میں
 کھو کر رہ جاتے تھے، اسی لیے ہمارا قافلہ سر شام ہی کسی موزوں مقام پر رُک کر ڈیرے ڈال دیتا تھا
 ہمارے اگلے پڑاؤ کچھ ابجد ہوز کی قسم کے تھے۔ ان کے کاغذی نام تھے ایل جی ۵۔
 ایچ ۳۔ ایچ ۴ وغیرہ۔ اور ان کے مقابلے میں زمین پر یا ہوائی اڈہ تھا یا پمپنگ سٹیشن،
 جیسے مصنوعی نام تھے ویسے ہی مصنوعی مقام تھے، لیکن اگر ہمارے راستے میں یہ مقامات نہ
 ہوتے، تو پھر اس دشت میں فقط خدا کی ذات ہی تھی۔ کہیں کہیں اس بکیراں ویرانے
 میں خانہ بدوشوں کے خیمے بھی نظر آتے تھے جن کے ارد گرد چند انسان، کچھ گدھے اور ایک
 کثیر تعداد بھٹیروں کی پھر رہی ہوتی تھی، جنہیں دیکھ کر اس کی رزاقی پر ایمان آ جاتا تھا۔ یہ بدو تو
 خیر بھٹیں کھا لیتے ہوں گے، لیکن وہ بھٹیں کیا کھاتی تھیں؟ یہ راز بھٹیروں اور ان کے رازق
 کے درمیان ہی تھا۔ بہر حال یہاں سمندر سے نہیں، بلکہ صحرا سے پیاسے کو شبنم ملتی تھی جو
 یقیناً رزاقی تھی۔

پانچویں روز اچانک ایک دریا نے ہمارا راستہ کاٹا۔ پل سے پار ہوئے، تو ایک نئی
 دنیا میں داخل ہو گئے۔ حدنگاہ تک ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ سنا ہماری نگاہ ایک
 پک بنک کرتی ہوئی ٹولی پر پڑی۔ انہوں نے ہمارا کانوائے دیکھا، تو ہماری طرف لپکیں۔
 ایک نہیں، دو نہیں، پوری سات دو شیرائیں! خدا جانے ان بنات العنفس کے جی میں کیا
 آئی کہ دن دہاڑے عریاں ہو گئیں۔ یعنی تقریباً عریاں! پیرا کی کالباس پہنے ہوئے تھیں

اور ابھی بھگی بھگی دریا سے نکلی تھیں۔ ہم نے انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی؛ ہمیں دیکھ کر تو خیر انہیں کیا حاصل ہونا تھا، لیکن ہم سکتے ہیں آگے۔ ہمارا کارواں تو کیا، گردشِ شام و سحر رک گئی۔ ساتوں کی سات سُرود آہو چہم اور مریں بدن۔ اس قدر دلربا جیسے غالب کی غزل، اسے دیکھو تو زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشان کیے ہوئے اُسے دیکھو تو سُرے سے تیز دشنہ مڑگاں کیے ہوئے اور وہ جو ذرا ہٹ کر مسکرا رہی تھی؛ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے اور ہم کہ مدت ہوئی تھی یار کو مہماں کیے ہوئے جگر لخت لخت سے دعوتِ مڑگاں کرتے آگے بڑھے۔

بعد میں سنا کہ ہمارے سالار کارواں بھی اس حُسن کی یلغار کے آگے تھوڑی دیکے لیے سالار سے انسان بن گئے اور جیپ روک کر انہیں ہیلو کہا اور چلے تو ایک مدت تک پیچھے تا کا کیے۔ جب مقامی لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایک سے بڑھ کر ایک نو بہارِ ناز کون ہے تو معلوم ہوا کہ دخترانِ یہود ہیں اور یہ کہ ہم دریائے اُردن عبور کر کے فلسطین میں داخل ہو چکے ہیں۔ فلسطین کی اٹھان کشمیر یا سوات سے مشابہ ہے۔ انگریزا سے دیکھتے ہی ہوم یاد کرنے لگے اور ہمیں تو صحرائے عراق کی ریت اور لاوے کی درشتی کے بعد فلسطین کا سبزہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زیر پاؤں پر نیاں آمد ہے؛ چھوٹی چھوٹی یہودی بستیوں سے گزرتے تو معلوم ہوتا سیکنی کلر میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ زنگارنگ کایٹج، وہ مدرسے کی سُرخ و سپید عمارت، وہ دلکش سینما ہال، وہ دلاویز سینا گاگ اور مکانون سے کہیں زیادہ حسین ان کے مکین جنہیں سات دن کی مسلسل دشتِ پیمانی کے بعد دیکھنے کو اگر ٹکٹ بھی لگتا تو ہم فوجی رعایت نہ مانگتے۔ اور اب کہ یہ لوگ برضا و رغبت ہمارے کارواں کے دونوں جانب صف بستہ کھڑے تھے، ہم اپنی خوبی قسمت پر ناز کرتے آگے بڑھتے گئے۔

ہمارا اس شام کا پڑاؤ جیفہ تھا۔ جیفہ سے کوئی ایک میل ادھر ہمارا کارواں رکا

اور ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ زن ہوا۔ برگیڈ کمانڈر صاحب نے شاید ہمارے دلوں کو ٹٹول لیا۔ سر شام ہی اعلان کر دیا کہ حیفہ دیکھنے کی عام چھٹی ہے۔

۱۹۴۲ء میں اسرائیل ابھی وجود میں نہیں آیا تھا، لیکن یہودی فلسطین پر چھا رہے تھے اور حیفہ تو ایک پکے ہوئے پھل کی طرح اُن کی گود میں گرنے کو تھا۔ اکثر یہودی یورپ سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ نتیجتاً حیفہ کا مزاج نہ صرف عمارات بلکہ عام طرز زندگی میں بھی فرنگیانہ تھا۔ عرب تھے، لیکن کم اور وہ بھی مزدور قسم کے۔ حیفہ کے مزاج کو متاثر کرنا تو درکنار، حیفہ کے مزاج دان ہی نہ تھے۔ بیچارے اپنے گھر میں اجنبی تھے۔

پہلی رات شہر میں گئے، تو ایک مشہور تفریح کدہ "پراسز" میں جا داخل ہوئے۔ یہاں کے ماحول میں وہ بغداد کے کبیروں کی گرج چمک اور ژالہ باری نہ تھی۔ اس جگہ کی کشش کے عناصر حُسن اور سکون تھے۔ مرد باوقار اور خواتین باتمکین، لیکن تمام تر یہودی۔ کوئی دیسی یعنی عرب وہاں موجود نہ تھا۔ بار پر گئے تو مقبول ترین مشروب مالٹے کاڑس نکلا، لیکن یہ ہمارے ہم وطن مالٹے نہ تھے۔ پاکستانی مالٹے حیفہ کے مالٹوں کے سامنے برادرِ خود اور وہ بھی سوتیلے نظر آتے ہیں۔ فلسطینی مالٹے نہ صرف قامت میں بزرگ تھے، بلکہ لذت میں بھی دو آتشہ تھے۔ یہ ہوائے فلسطین کا فیض تھا یا یہودی محنت کا ثمرہ، اس بات کی تحقیق تو نہ ہو سکی؛ البتہ ہم نے دونوں ہاتھوں سے ایک مالٹا اٹھا کر مشین میں رکھا، تو بار میڈ نے ایک رطل گراں بھر کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور جب پی چکے تو وہ آسودگی میسر ہوئی کہ اس کی یاد مع ذائقہ آج تک باقی ہے اور اب گوجرانوالہ کے مالٹے اپنا خون جگر بہا کر بھی وہ بات پیدا نہیں کر سکتے۔ اُس رات ہم نے دیکھا کہ کئی مُستند انگریز خوار اس نئے مشروب کی خاطر دسکی سے دستبردار ہو گئے۔

دوسرا دن بھی حیفہ کی سیر میں گزرا۔ حیفہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر واقع ہے؛ لہذا

وہ اپنے رُخِ زیبا کا کوئی گوشہ بھی چھپا نہیں سکتا اور نہ چھپانا چاہتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس کا حسن بند نقاب کھولے تو سقزاح کی طرح سامنے کھڑا ہے۔ ڈھلان خدانے بنائی ہے مکانِ انسان نے اور دونوں نے مل کر ایک دلکش شاہکار پیدا کر دیا ہے۔ ایک فیلسوف ساتھی سے بات کی تو بولا:

”حیفہ پر ہی کیا منحصر ہے، ہر شاہکار فطرت سے تعاون کرنے پر ہی وجود میں آتا ہے“
مسئلہ مشکل تھا، لیکن مثال کی مدد سے کچھ سمجھ میں آگیا۔

اگلے روز علی الصبح ہمارا کارواں پھر روانہ ہوا۔ حیفہ سے نکلے تو ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کو بڑھے۔ پہلے تیس چالیس میل یہودیوں کے باغیچوں کے تھے جن کے شاداب ماٹے آب و رنگ میں اُن یہودی دوشیزاؤں کو شرماتے تھے جو ہاتھ ہلا ہلا کر بے شرمائے ہمیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ پاس ہی یہودی کاشت کار مشینوں سے صحرا کو گلزار بنا رہے تھے اور ہم فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار۔

پھر دفعۃً باغیچوں کا سلسلہ ختم ہوا اور کیا دیکھتے ہیں کہ مختلف قطععاتِ زمین میں اُڈنٹوں اور گدھوں کے ناہموار تعاون سے ہل چلایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہ عرب کاشت کار ہیں۔ کھیتوں کے قریب سے گزرے تو عرب بچے بھاگے بھاگے آئے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر ”سگاراہ رفیق“ کی صدا لگانے لگے۔ صدا کا ترجمہ کرایا تو معلوم ہوا سگریٹ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہم مسافروں کو پہلے تو دشت کو دیکھ کے گھریا دیا اور پھر سوچا کہ ہمارے عرب بھائیوں کا کیا بنے گا۔ اور بنایہ کہ چند ہی سال بعد فلسطین جزائیہ سے نکل کر تاریخ میں چلا گیا اور اُس کی جگہ اسرائیل نے لے لی اور ہمارے عرب بھائی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں منتقل ہو گئے اور بظاہر وہیں رہیں گے کیونکہ انرا (UNRRA) کے مُفت اُشٹنوں کے علاوہ امریکہ کے خیراتی بگرٹوں نے اُن کے دل سے یادِ وطن کی غلش خاصی ملائم کر دی

ہے۔ بلکہ سنا ہے کہ اُن کا قاف حلق کی بجائے اَب ناک سے نکلتا ہے۔
 حیفہ کے بعد اگلا پڑاؤ اسلوج تھا۔ اسلوج صحرائے سینائی کے مشرقی حاشیے پر واقع ہے۔ اسلوج میں رات گزار کر صبح دشتِ سینائی کی پہنائی سے گزرے تو ویرانی سے خوف سا آنے لگا۔ انگریزوں نے اس ریگ زار میں یہ سڑک نہ بنائی ہوتی، تو اسمعیلیہ پہنچتے پہنچتے ایک عمر گزر جاتی اور شاید یہ تاخیر ہمارے لیے ایسی ناموافق بھی نہ ہوتی کہ ردمل سے فوری ملاقات بھی بہت صحت افزا قریب نہ تھی۔ خیر ہمارے جذبات کچھ ہی ہوں سڑک کا حال کچھ ہی تھا،
 شام کو نہر سویر عبور کر کے اسمعیلیہ میں داخل ہوئے۔ رات کا بیشتر حصہ اسمعیلیہ کلب میں گزارا، کیونکہ تہذیب سے قریب ترین آخری شب تھی۔ اس کے بعد صحرائے لیبیا کی راتیں تھیں اور جنگ کی بد تہذیبی۔

اسمعیلیہ کلب کے ماحول سے ہر طرف پونہ (یا شاید پونہ کننا زیادہ صحیح ہے) ٹپکتا تھا۔ لمبی مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے کرنیل اور جرنیل جا بجا بکھرے پڑے تھے جن کی خدائیا سے محاذِ جنگ تو محفوظ تھا، لیکن کلب کا محاذ اُن کی ہمہ وقتی زد میں تھا۔ ان کی کلب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اُس کے فرنیچر کا حصہ معلوم ہوتے تھے؛ البتہ کھانا پیتا اور ناچتا گانا فرنیچر؛ سوائے لڑنے کے ہر کام کے لیے تیار تھے۔ کلب کے سبز قطعات پر برقی پنکھوں کے نیچے پیٹھ کر بیٹھ پینا ان کا دوسرا اہم کام تھا۔ خدمت کے لیے گمری لال ٹوپوں والے اور گارڈھے کالے چہروں والے سوڈانی خدمت گار تھے جو پونہ کلب کے بیروں کے عم زاد معلوم ہوتے تھے۔ صرف "کوئی ہائے ہنگی مانوس آواز نہیں آرہی تھی۔"

صبح محاذِ جنگ کی طرف بڑھنا تھا؛ لہذا رات کو ہمارے انگریز ساتھیوں نے معمول

○ یہ آج سے پندرہ بیس برس پہلے کے تاثرات ہیں۔ فلسطینی فدائین کے موجودہ جذبہ جاں نثاری اور وطن پرستی کو مصنف سلام کرتا ہے۔

سے بہت زیادہ پی اور زیادہ دیر پی کہ جگ پر جانے کی یہی اُن کی ریت ہے۔ اس خاکسار کے پاس کنارہ سوز تو تھا، لیکن کوئی سفینہ نہ تھا کہ اُسے جلا کر مسلمانوں کی ریت پوری کرتا۔ ہاتھ اٹھائے اور دُعائے خیر مانگی۔

کوئی دوپہر کا وقت تھا کہ ہم قاہرہ پہنچے، بلکہ قاہرہ سے گزرے کہ وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی۔ پاک دہند کے مسلمانوں کے دماغ میں قاہرہ کا تصور سراسر جامعہ ازہر کا تصور ہے یعنی اہل قاہرہ یا رکوع میں ہیں یا سجود میں۔ ہاتھ میں کوزہ ہے یا تسبیح اور سر پر سرخ رومی ٹوپی۔ لیکن قاہرہ کے بازاروں سے گزرتے ہوئے اس شہر کی جھلک دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہاں ازہر کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور اُسے دیکھ کر جی چاہا کہ

اک لمحہ یہاں دم لوں
دامن کو ذرا بھروں
اُن پھولوں کی خوشبو سے
جو سامنے کھلتے ہیں!

اور شاید نادانستہ طور پر دم لینا شروع بھی کر دیا تھا کہ پھلی گاڑی نے زور سے مارن دے کر ہارا رومان پریشان کر دیا۔

مقوڑی دیر بعد دریائے نیل عبور کیا جو شہر کے وسط سے بہتا ہے اور اہرام کی طرف بڑھے۔ مینا پہنچ کر ایک بلندی پر کھلے صحرا میں داخل ہوئے اور غضب خدا کا یہاں — یعنی قاہرہ کی بجائے صحرا میں — کا نوائے نے دم لیا۔ گاڑی سے نکل کر پیچھے قاہرہ پر نگاہ ڈالی کہ شاید انسانوں کی بستی پر یہ آخری نگاہ ہو۔ اور جب دیکھا تو ہمیں قاہرہ کا شاداب نخلستان دکھائی دیا جو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اُس کا تصور کر لیا اور یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کو تہ تیغ پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ لیکن خوف مرگ کے ساتھ ایک کونے سے یہ خیال بھی آنودار

ہوا کہ شاید بیچ نکلیں اور کسی دن واپس آکر اسی قاہرہ کی زندگی میں حصّہ لے سکیں۔ بہر حال عین اُس وقت ہمارے دل کے اندر زہیم درجا کے معرکے میں رجا کی حالت خاصی پتی تھی۔ ہم کوئی چھ گھنٹے روال رہے۔ دھوپ سے ہم اپنے وطن میں بھی مانوس تھے لیکن صحرا کی دھوپ یوں لگتی تھی جیسے عارضۂ قلب ہو رہا ہو؛ چنانچہ دل کو تھامے بالآخر سکندریہ کے قریب امریہ پہنچے اور رات کے لیے ڈیرے ڈالے۔ جوں جوں رات قریب آتی گئی، گرمی غائب ہونے لگی۔ نصف شب کو خشکی کا یہ عالم تھا کہ ٹھنڈا عارضۂ قلب ہونے لگا اور سپاہی دلیپ سنگھ نے تو سچ مچ سینے پر دھر کے ہاتھ کہا یا مر گیا اور مرنے لگا۔ حوالدار میت سنگھ نے دن رات کے درجہ حرارت کو مد نظر رکھتے ہوئے نہایت وثوق سے کہا کہ یہ بیماری دل کی نہیں اور نہ علاج ہی کی ضرورت ہے۔ دلیپ سنگھ محض گرم سر ہو گیا ہے۔ صبح کا انتظار کیا جائے کہ سرد گرم ہو کر شفا پالے؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ طلوع آفتاب کے ساتھ دلیپ سنگھ نے آنکھ کھولی۔ سینے پر سے ہاتھ اٹھایا اور مسکرا دیا۔

اگلی صبح ہمارا کارواں ساحلی سڑک کے راستے سلوم کو روانہ ہوا۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا گیا ہمارا درجہ حرارت بھی بلند ہونے لگا۔ بارہ بجے کے قریب سورج کے ساتھ ہم بھی نصف النہار پر تھے۔ بہر حال اب شکایت کا مقام نہ تھا کہ کارزار کے مضافات میں تھے۔ وہ مقامات جو ان دنوں تاریخ کی زبان پر تھے، ہمارے رستے میں یکے بعد دیگرے آنے لگے مثلاً العالمین، مرسی مطروح، میدی بارانی وغیرہ۔ العالمین نے ابھی وہ شہرت حاصل نہیں کی تھی جو پردہ تقدیر میں اس مقام اور لارڈ منٹگری کی تاک میں بیٹھی تھی۔

مرسی مطروح پہنچے تو سال گزشتہ کی ایک طرف جنگ کی کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اسی مقام پر لارڈ ویول اور ان کے چوتھے انڈین ڈویژن نے مسولینی کی فوجوں کو مرفا بنایا تھا جنگ ایک طرف اس لیے تھی کہ اس میں لڑنے کا پارٹ صرف ہمارے ڈویژن نے ادا کیا تھا۔

یعنی اطالوی سپاہی شلیج پر آئے تھے، لیکن پھرتی سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے، بلکہ کچھ دُور جا کر
 ایک لخت تھم گئے تھے کہ تعاقب کنندگان کا ناحق دم نہ پھولے۔ اسی معرکے کے متعلق کسی
 نامہ نگار نے ہمارے سپاہی کی رائے پوچھی، تو اُس نے جواب دیا: ”اچھی ایکسر سائز تھی؛ یعنی
 یہ اسے نقلی مشق سمجھ رہا تھا جو امن کے زمانے میں کی جاتی ہے۔“

اسی جنگ میں جب اطالوی افسروں کو مورچوں سے نکالا گیا، تو ان کے ساتھ ان کی
 دانتائیں بھی برآمد ہوئیں۔ اس پر ہمارے ایک پنجابی سپاہی کی غیرت جوش میں آگئی اور اُس
 نے ایک اطالوی کرنل کے ذاتی اسلحہ کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے اُسے طعنہ دیا کہ اور نہیں تو ان
 ”تیویوں“ کی خاطر ہی جان پر کھیل جاتے اور پھر اُسے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ ”چھوٹی تے
 پانی پا کے ڈب مر!“

اور یہ سطور لکھتے ہوئے وہ مرصع پستول بھی یاد آتا ہے جو اسی مرسی مطروح میں
 کیپٹن میاں خاں نے ایک اطالوی بٹالین کمانڈر کے گلے سے اتار کر تحفہ ہمارے گلے میں
 ڈال دیا تھا اور بعد میں اسی پستول کی بدولت ہم ایک ناکردہ قتل میں ماخوذ ہوتے ہوتے
 بچ گئے۔ لیکن یہ قصہ اپنی جگہ پر!

اس لمحے اگرچہ مرسی مطروح میں خاموشی تھی؛ تاہم طیور مطروح سے ایک اُڑتی
 سی خبر تھی کہ جنگ بہت دُور نہیں۔ سڑک کے کنارے ہر چند قدم پر کسی یونٹ کے نام کا بورڈ
 تھا یا تیر کا نشان، جو صحرا کی وسعت میں کسی چھپے پلائی ڈپو یا ورکشاپ کی طرف اشارہ کرتا تھا،
 مگر سب سے بڑا بورڈ جو نظر آیا کسی یونٹ کے بارے میں نہ تھا بلکہ مکھیوں کے متعلق تھا اس
 بورڈ پر قد آدم حروف میں لکھا تھا: KILL THAT FLY جو سراسر شجاعت کے
 منافی تھا؛ چنانچہ اسے پڑھ کر ہمارے غازی دلوں کو ندامت سی محسوس ہوئی کہ آخر مکھی مانا

○ عورتوں ○ بعد میں لفٹنٹ کرنل میاں خاں ایم سی ● ”مار داس مکھی کو“

کوئی مردانگی ہے لیکن بعد میں جب ان صحرائی مکھیوں سے ہمارے قریبی تعلقات قائم ہوئے تو معلوم ہوا کہ جنگ میں مگس کشتی ایک خاصا قابل فخر کارنامہ ہے۔ اس جنگ میں ہمارے سامنے تین دشمن تھے: جرمن۔ اطالوی اور مکھیاں۔ جرمنوں کا معاملہ تو ذرا مختلف تھا لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ ایک اطالوی کی بجائے ایک مکھی مارنا زیادہ نفع بخش ہے کیونکہ عربی صلاحیت کے اعتبار سے ان ریگستانی مکھیوں کا مقام اطالویوں سے کسی قدر بلند تھا اور یہ وجہ تھی کہ وہ بورڈ لگایا گیا تھا، ورنہ ہمیں ان غیر ملکی مکھیوں سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔ یہ محض

○ SELF DEFENCE کا تقاضا تھا۔ اگر ہم سے مکھیاں جیت جاتیں، تو ہمارا وقت میدان جنگ کی بجائے ہسپتال میں گزرتا۔ یا شاید ہسپتال سے بھی ڈرا آگے!

مطروح سے نکلے، تو سیدی بارانی سے ہوتے ہوئے شام کو سلوم پہنچے۔ یہ مقام مصر اور لیبیا کی سرحد کے علاوہ امن اور جنگ کی سرحد پر بھی واقع تھا۔ رات وہیں جنگ کی طرف پلٹھ کر کے بحیرہ روم کے کنارے گزار دی اور صبح دہرہ ہلایا یہ سے گزر کر طبرق سے چند میل ادھر بل حمد کے مقام پر فروکش ہوئے۔ یہ ہمارے کارواں کی آخری منزل تھی، لیکن کوئی بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہماری منزل مقصود بھی تھی۔ کیونکہ اب ہم ریزرو برگیڈ ہونے کی حیثیت سے میدان جنگ کے دروازے پر بیٹھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ درون خانہ کیا ہو رہا ہے۔

صرف چند میل جنوب میں جرمن فوجیں ہمارے برگیڈوں سے برسرا پیکار تھیں۔ توپوں کی گھن گرج سے فضا میں ایک ہیبت ناک اور مستقل سی گونج تھی جس میں شنوندگان گرامی یعنی ہمارے لیے کچھ تواضع کا رنگ نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر گولہ ہمارے سر پر ہی بار امانت ہلکا کرے گا؛ چنانچہ پہلی رات گولہ شماری میں ہی کٹی۔ دوسری رات کسی قدر

○ ذاتی حفاظت

مانوس ہونے لگے، لیکن مانوس ہونے کے بعد بھی ہمارا استعمال تو یہی تھا کہ جونہی ضرورت پڑے ہمیں مقل میں جھونک دیا جائے۔ سو ہماری دماغی کیفیت وہی تھی جو بقرعید سے پہلے ہر دور اندیش بکرے کی ہوتی ہے اور مشکل دو ہفتے گزرے تھے کہ ہمارے برگید کی بقرعید آگئی۔ یہ تقریب ہم نے جرمنوں کے ساتھ کس دھوم سے منائی، اس کا ذکر ذرا آگے آئے گا۔

جنگ سے پہلے

طبرق پر برطانوی قبضہ ضرور تھا، لیکن تھاخانہ بدوشوں کا سا۔ کیونکہ نیچے جنوب مغرب سے جرمن فوجیں ہمارے عدم اور نائٹ برج کے مورچوں پر بے حد غیر دوستانہ دباؤ ڈال رہی تھیں اور ہمارا قبضہ بڑی شدت سے ڈمگارا ہوا تھا۔ امکان تھا کہ جرمن کسی لمحے ان دو مقامات کو روند کر طبرق پر جھپٹ پڑیں گے؛ لہذا طبرق میں جہاں ڈٹ کر لڑنے کا سامان کیا گیا تھا وہاں رختِ سفر بھی باندھ رکھا تھا کہ ناچار بھاگنا پڑے، تو کھلے بستر فرار میں حائل نہ ہوں۔ ہمارا برگیڈاب اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ طبرق جانے کا حکم ملتا ہے یا عدم کا۔ ان دو مقامات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا مشکل تھا۔ ہم جدھر جاتے، راہی ملکِ عدم ہی تھے۔

بل حمد میں بیٹھے ہوئے جنگ نہ صرف سنائی دیتی تھی، بلکہ رات کو دکھائی بھی دیتی تھی، لیکن دو دن دیکھنے سننے کے بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے جنگ نہیں، یونہی پڑوس میں تماشا ہو رہا ہے۔ جی چاہتا کہ یہ تماشا ذرا اور قریب سے دیکھیں؛ چنانچہ جامت کے بہانے طبرق جانکلے۔ گویا جرمنوں سے چند قدم ہی ادھر — نائی کی کرسی پر بیٹھے، تو محسوس ہوا کہ آرائش گیسو کے لیے اس سے بہتر ماحول قاہرہ میں بھی نہ ملے گا۔ نائی کی دکان کے اندر قنیچیاں اور اُسترے چل رہے تھے اور باہر توپیں اور بندوقیں دندنارہی تھیں۔ اگر کلینت توپیں اور

بندوقیں تھم جاتیں تو قینچی کی لے ٹوٹ جاتی اور اُترے کی تال بگڑ جاتی، لیکن جرمنوں کے ہوتے ہوئے ایسے حادثے کا امکان نہ تھا؛ چنانچہ ہماری حجامت پورے جنگی اعزاز کے ساتھ ہوتی رہی۔

لیکن اس اعزاز کے باوجود ہم حجامت کے دوران کانپتے ہی رہے۔ وہ اس لیے کہ طبرق کے چاروں طرف خاردار تار کی حفاظتی باڑ لگی ہوئی تھی اور بل حمد سے آتے ہوئے باڑ کے اندر داخل ہونے پر یوں محسوس ہوا تھا کہ محفوظ ہونے کی بجائے محسوس ہو گئے ہیں؛ چنانچہ ہم دل ہی دل میں دُعا مانگتے رہے کہ ”الہی! اثنائے حجامت میں جرمنوں کو حملے کی توفیق نہ بخشنا۔ لڑائی میں ہارنا اور ہتھیار ڈالنا برحق ہے، لیکن کھلے میدان میں۔ طبرق کی چار دیواری میں تو ہتھیاروں کے علاوہ اپنے آپ کو بھی ڈالنا پڑے گا۔“ ہماری دُعا قبول ہوئی اور حجامت ختم ہوتے ہی ہم باڑ سے نکلے چیلوں میں بیٹھے اور بل حمد کی کھلی فضا میں جا کر دم لیا۔

خیال تھا کہ اب کسی لمحے لڑائی کا حکم ملتا ہے، لیکن کئی روز گزر گئے اور وہ لمحہ نہ آیا۔ ہم نے سوچا فراغت ہے غسل کیوں نہ کر لیں۔ پہلے غسل کو بہت عرصہ تو نہیں ہوا تھا۔ یہی بیس پچیس روز ادھر کی بات تھی اور ہر چند کہ جنگ بھی قریب تھی؛ تاہم بحیرہ روم قریب تر تھا اور اس کی گنگناتی، جھملائی موجوں کی صدا مسلسل دامنِ دل کھینچ رہی تھی؛ چنانچہ سہ پہر کا وقت تھا کہ یکایک مثلِ آزاد:

یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل
 ٹھٹھا ٹھٹھا ذرا روم چل!
 اور ذرا برعکس آزاد: وہاں جا کے کپڑے بدن سے اتار
 سمندر کی موجوں پہ تھا میں سوار

○ مولانا محمد حسین آزاد

اما بعد بحیرہ روم کے شفاف زمردیں پلنی کے گوارا اور گداز مس نے وہ آسودگی بخشی کہ
 پے درپے غوطے لگانے شروع کر دیے اور اپنی ہم غوطہ مچلیوں کی طرح زیر آب بھرنے لگے۔
 یہ شغل ایک محویت کے عالم میں کچھ عرصے تک جاری رہا۔ آخر سطح آب پر آئے اور آنکھ کھلی تو
 معلوم ہوا کہ سود و سوگزدرون سمندر اچکے ہیں یعنی اگر بحیرہ روم کی شارکوں نے ایک منٹ کے
 اندر اندر صدق دل سے ہامتا بودھ کے ہاتھ پر بیعت نہ کر لی، تو ہماری خیر نہیں۔ ساحل کی طرف
 دیکھا تو بے اختیار منہ سے نکلا:

کشتی شکستگانیم اے بادِ مشرطِ بر خیز!

معا خیال آیا کہ ہماری جنگ اور حیات تو تمام ہو گئی، لیکن پیمانہ گان کی نظروں میں
 نہ مردوں میں ہوں گے نہ زندوں میں بس MISSING BELIEVED KILLED ہی
 سمجھے جائیں گے۔ بچنے کا معروف ذریعہ تو ایک ہی تھا کہ بادِ مشرط چل پڑتی اور ہمیں اڑا کر
 ساحل تک لے جاتی، لیکن اب کون اُسے شیراز سے لے کر آتا؟ اللہ کا نام لیا اور اپنی محدود
 پیرا کا نہ استعداد کے سہارے ساحل کی طرف تیرنا شروع کیا۔ اس نمم میں خدا جانے ایک ماہ
 لگایا ایک سال، تیرتے تیرتے آخر کار ہم ساحل پر وارد ہوئے، لیکن یہ وُرد کچھ نیمے دروں نیلے
 بروں کا ساتھ تھا۔ یعنی ہمارا دھڑ تو سمندر میں ہی تھا، صرف سر اور بازو ساحل کی ریت تک پہنچ
 سکے اور وہیں منجمد ہو گئے۔

جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ کسی زمانے میں سمندر میں نہانے آئے تھے۔ شام ہونے
 کو تھی کہ اٹھے اور رُٹھکتے رُٹھکتے کیمپ میں پہنچے۔ جب خبر عام ہوئی کہ ہم زندہ ہیں تو لوگ ہمیں
 قُرب و جوار سے دیکھنے آئے۔ چند بدتمیزوں نے ہم سے بحیرہ روم کی دلچسپیوں کے متعلق سوال
 بھی کیے۔ گویا ہم نے اس لیے جان کی بازی لگائی تھی کہ ان مسخروں کے ہاتھوں اپنی پریس
 ○ ”لاپتہ ہے غالباً مارا گیا“ — یہ مجھ جنگ میں لاپتہ سپاہیوں کے متعلق اکثر استعمال ہوتا ہے۔

کانفرنس کرا لیتے؛ چنانچہ ہم نے اکثر سوالوں کے جواب محفوظ رکھے۔
 صبح ہوئی تو وہ حکم بھی آگیا جس کا انتظار تھا۔ یعنی یہ کہ برگید آگے بڑھ کر سیدی رزیغ
 کی پہاڑی پر دفاعی مورچے قائم کرے اور جرمنوں کے حملے کا منتظر رہے کیونکہ آثار سے
 پیدا تھا کہ جرمن طبرق کی بجائے سیدی رزیغ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دس دن کے آرام کے بعد ہمارا برگید بل حمد سے اٹھ کر سیدی رزیغ میں مورچہ گیر
 ہوا۔ ہماری پیادہ فوج کے دستے پہاڑی کی جنوبی ڈھلان پر — یعنی دشمن کے آمنے سامنے
 — کیل کانٹے بلکہ ذرا زیادہ مہلک ہتھیاروں سے لیس ہو کر بیٹھ گئے۔ ادھر ہم ہیڈ کوارٹر
 والے پہاڑی کی شمالی ڈھلان پر زمین دوز مورچوں میں داخل ہو گئے جہاں باقاعدہ گنل آفس
 کھولا اور ایکس چینج لگایا۔

ایک دن گزر گیا۔ ایک اور گزر گیا، لیکن جرمن حملے سے گریز کر رہے تھے۔ ہم مسلسل
 دو روز کے امن سے تنگ آ کر غاروں سے نکلے اور سیدی رزیغ کی وسیع سطح مرتفع پر مگرگشت
 کرنے لگے۔ اس پہاڑی پر پچھلے سال کئی معرکے ہو چکے تھے جن کے نشان بیسیوں بیگار
 توپوں، سینکڑوں ناکاؤ گولوں اور ہزاروں کارگزر مگر پوشیدہ بارودی سُرنگوں کی شکل میں بکھرے
 پڑے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ایک چلتی لاری کا پاؤں نادانستہ طور پر کسی سُرنگ پر آگیا اور
 ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنے سواروں سمیت خاک و خون میں بدل گئی۔ سیدی رزیغ کی سطح
 پر ہر قدم الگ الگ بھونک بھونک کر رکھنا پڑتا تھا کہ نیچے کوئی آفت نہ خوابیدہ ہو۔

سیدی رزیغ کی زندگی عام روزمرہ کی آسائشوں سے یکسر خالی تھی۔ جرمن توپیں کسی
 وقت ایک سو الیہ گولہ پھینک سکتی تھیں اور پھر نہایت آتشیں مکالمہ شروع ہو جاتا؛ لہذا ہمیں
 کھڑا کرنے کا تکلف کسی قدر سبب تھا۔ بس ہر روز ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا، ابلی بیف کا ایک ٹین

یعنی بیل کا گوشت BULLY BEEF ○

اور مچل کا ایک ڈبہ بل جاتا جو کسی چٹان کی اوٹ میں بیٹھ کر ان دھوئے ہاتھوں سے کھا لیتے۔ وہاں ہاتھ دھونے کے لوازمات میسر نہ تھے۔ پانی فقط زبان تر کرنے کے کام آتا تھا۔ باقاعدہ پانی پینے کا دستور نہ تھا اور ہاتھ منہ دھونا تو ایسی عیاشی تھی جسے یاد کرنے کی دل عزیز کو اجازت نہ تھی۔

چوبیس گھنٹوں کے لیے پانی کا راشن فقط ایک بوتل تھا اور صحرا میں پیاس کو واجبی طور پر بچھانے کے لیے بھی ایک واجبی سی جھیل کی ضرورت ہوتی ہے؛ چنانچہ ہم نے کبھی ایک سالم گھونٹ کو اپنے حلق سے نیچے اترتے نہ دیکھا۔ بس بوتل کو منہ سے لگاتے اور جو نہی زبان کو ایک گرم مطوب سا احساس ہوتا اُسے زبان سے علیحدہ کر دیتے۔ بخدا ہمارا پانی پینا پیاس بچھانے کے لیے نہ تھا، بلکہ اس لیے کہ بلی بیف کے سُست رولتھوں کا گلے میں کیو، نہ لگ جائے۔ پھر ہر کھانے میں خواہ وہ بلی بیف ہو یا سینڈویچ، ایک مناسب مقدار صحرائی ریت کی بھی ضرورت شامل ہو جاتی۔

نہ پوچھ نسخہ، موسم جراثیمِ دل کا

کہ اس میں ریزہ الماس جزوِ اعظم ہے

رہا غسل تو وہ ماضی قریب کے تجربے کے بعد محض ایک واہمہ تھا۔ ایک سپنا اور سپنا بھی کبھی نہ آنے والا کہ بغیر نیند کے سپنے نہیں آیا کرتے اور سیدی رزیغ میں نیند کہاں؟ جمل بیٹھ گئے یا لیٹ گئے، بے بستر و بالین رات گزار دی، سوائے اس کے کہ کوئی گولہ مچل ہو تیسرا دن تھا اور جرمن حملے کا نام نہ تھا۔ ہمارے لیے حملے کا انتظار خود حملے سے زیادہ صبر آزما تھا۔ صبح ہی ایک چٹان سے لگ کر بیکہ و تنہا بے آب و دانہ زندگی سے بیزار بیٹھا تھا کہ ایک خدا کا بندہ قریب آتا دکھائی دیا۔ پاس آکر رُکا اور سلیوٹ کر کے کہنے لگا:

”صاحب! ہمارے صاحب نے آپ کو بلایا ہے“

تنگ تو بیٹھا ہی تھا، جواب دیا:

”جاؤ، تم اپنے صاحب سمیت بہشت میں جا سکتے ہو، سمجھے؟“

غالباً کچھ نہ سمجھا اور چلا گیا، لیکن ایک گھنٹے کے بعد پھر نکلا اور بولا:

”صاحب کا اصرار ہے کہ ضرور آؤ۔“

اب کے ازراہ لفظن صاحب کا نام پوچھا تو بولا:

”کیپٹن مظفر۔“

دل میں کہا ”کوئی ہوگا“ لیکن کبھی سنا تھا نہ دیکھا۔ پیامبر سے پوچھا:

”تمہارے صاحب ہمیں جانتے ہیں؟“

جواب میں کہنے لگا:

”کیپٹن صاحب نے صرف اتنا کہا ہے کہ سیدی رزیغ میں نیا برگید آیا ہے۔ اگر

اس میں کوئی دیسی افسر ہو تو اُسے کہو خدا کے لیے مجھے آکر ملے۔ میں چھ ماہ سے ایک پائیز

یونٹ لیے اکیلا صحرا میں بیٹھا ہوں اور کسی ہم جنس سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔“

یہ دل گداز کہانی سنی تو پیامبر کے ساتھ ہو لیا اور سیدی رزیغ سے کوئی دو میل پیچھے

مشرق کو ایک پائیز کپنی کی لائٹوں میں جا داخل ہوا۔ آگے ایک پنجابی کپتان کا کھلکھلاتا ہوا

چہرہ اور کھلے مہمان نواز بازو تھے۔ معانقے سے فارغ ہوئے تو بولے:

”تعارف بعد میں ہوتا ہے گا، پہلے غسل کر لو۔“

سیدی رزیغ میں غسل کی دعوت! گویا کپتان صاحب ایک عام فہم صحرائی مذاق کر

رہے تھے۔

عرض کیا:

”پہلے تعارف ہی ہو جائے، تو بہتر ہے۔ غسل تو اب وطن میں جا کر ہی میسر ہوگا۔“

جواب میں مظفر خاموش رہے اور میری بے یقینی کا احترام کرتے ہوئے میرا بازو تھامے چل پڑے اور آہستہ سے مجھے ایک خیمے کے اندر دھکیل دیا۔ اندر کیا دیکھتا ہوں کہ پانی سے لبریز ایک ٹب پڑا ہے جو صحرا کے پیاسے کو پہلی نگاہ پر تالاب نظر آیا۔ دوسری جانب صاف خشک تولیہ اور صابن رکھا تھا۔ ادھر ہم تھے کہ کبھی اپنے منہ کو اور کبھی ان کے گھر کو دیکھتے تھے۔ کپتان صاحب نے ہمارے چہرے کی کیفیت دیکھی تو مسکرائے اور خیمہ بند کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہم نے کیا اسے غسل نہیں کہنا چاہیے۔ ہمارے تیشہ و سوختہ جسم نے انگاروں کی طرح پانی جذب کر لیا۔

اس عشرتِ نایاب سے فارغ ہوئے تو کپتان صاحب کا اردلی ایک تازہ دھلا ہوا خاکی جوڑا لایا۔ بتایا گیا کہ ہمارے اپنے کپڑے دھلنے کے لیے بھیج دیے گئے ہیں۔ یہ یونیفارم نہ تھی، خاکی رنگ میں عروسی جوڑا تھا؛ پہنا تو محسوس ہوا کہ صحرا میں جنگ لڑنے نہیں آئے، ذرا ہٹلرنے کا کٹیل پارٹی پر آنے کی زحمت دی ہے۔ اتنے میں دوسرے خیمے سے مظفر کی آواز آئی:

”اگر نہا چکے تو جلد آؤ، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

یہ دوسرا مذاق حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ سیدی زریغ میں گرم کھانے کا وجود؛ ناممکن صحرا میں تو صرف ایک ہی کھانا تھا؛ بلی بیف، جوٹین میں سرشام ہی چراغِ مفلس کی طرح بجھا سا رہتا تھا، لیکن کھانے کے خیمے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں! کیا دیکھتا ہوں!! مرغِ مسلم اور بھاپ کے بادل، پلاؤ اور بھاپ کی گٹھائیں اور کیا کیا کچھ۔ میرے دل نے لگاتار دو تین دھڑکنیں مس کیں۔ اگر رُک بھی جاتا، تو روتا تھا۔ اُس حج کا ثواب جو ابھی ہم نلے کرنا تھا، دل ہی دل میں کیپٹن مظفر کی نذر کیا اور مرغ کو وہاں پہنچایا جہاں اُس کا خیمہ تھا۔

پھر کپتان صاحب سے باتوں کا دور شروع ہوا۔ یہ شخص شیریں خصال ہی نہ تھا،

شیریں دہن بھی تھا۔ اس کی باتیں سنتے سنتے دو گھنٹے گزر گئے۔ یوں جیسے دو لمحے گزرے ہوں۔ دلنوازی کا یہ سلیقہ پہلے نہ دیکھا تھا۔ اگر جنگ سے اٹھ کر نہ آیا ہوتا تو مظفر کی باتیں ہی سنتا رہتا، لیکن خیال آیا کہ کہیں طویل غیر حاضری کی وجہ سے بھگوڑا ہی نہ قرار دیا جاؤں رخصت چاہی اور برگیدہ ہیڈ کوارٹر پہنچا۔

شام ہونے والی تھی۔ معلوم ہوا ڈوٹیرن کمانڈر جنرل ریس (REES) تشریف لائے ہوئے ہیں اور تقریب یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں جرمن مورچوں پر ایک محدود حملہ کیا جائے والا ہے۔ مقصد اس شب خون کا یہ تھا کہ دشمن کے مزاج اور ارادے کا اندازہ لگایا جائے اور اس غرض کے لیے دشمن کے کچھ قیدی پکڑے جائیں۔ دشمن کو مار بھگانا یا اس کے مورچوں پر قبضہ کرنا مدعا نہ تھا۔

کوئی گیارہ بجے گھپ اندھیرے میں ہماری ایک پلٹن آگے بڑھی۔ اس پلٹن کے کاروبار اور خیر و عافیت کے متعلق پیچھے خبریں بھیجنے کے لیے ایک سگنل کا دستہ ساتھ کر دیا گیا اس دستے کے پاس دو گاڑیاں تھیں جن میں وائرلیس سیٹ رکھے تھے۔ دستے کے کمانڈر کیپٹن کار تھے جو میرے سینئر تھے۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ سگنل آفس میں ہلٹھ کروائرلیس سیٹ سے کان لگائے رکھوں اور جو ہنسی کوئی گرم خبر آئے جنرل ریس تک پہنچا دوں۔ جنرل موصوف کوئی بیس گز کے فاصلے پر اپنی وین (گاڑی) میں ہمہ تن انتظار تھے، جب گھنٹہ بھر گزر گیا اور شہزاد کی کوئی خبر نہ آئی، تو جنرل صاحب متفکر ہونے لگے اور صورتِ حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے اردلی کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے اردلی کو اطمینان سے جواب دیا کہ

NO NEWS

اور خدا جانے کیا سوچھی کہ ساتھ ان الفاظ کا اضافہ بھی کر دیا:

○ بعد میں لفٹنٹ کرنل مظفر۔ آج کل غالباً کھیوڑے میں رہتے ہیں۔

● کوئی خبر نہیں۔

“AND NO NEWS IS GOOD NEWS” ○

اردلی کم بخت نے ہمارا پیغام مع ہماری فلاسفی کے جنرل صاحب تک پہنچا دیا۔ ہماری فلاسفی بھی ایسی کیا تھی، فوجی حلقوں میں یہ فقرہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ صرف یہ کہ ایک سینڈ لفٹنٹ ایک جنرل کو اس بے باکی سے نہیں کہلا بھیجتا۔ تھوڑی دیر کے بعد اردلی پھر نمودار ہوا اور حسب توقع ہمیں بتایا کہ جنرل صاحب سلام کہتے ہیں۔ اٹھا جنرل صاحب کی دین کے پلس گیا۔ دروازے پر دستک دی اور چہرے پر ایک مصنوعی سکون بلکہ کانپتا کانپتا تبسم اور رکھ کر اندر پاؤں رکھا۔ اب جنرل صاحب کو جو دیکھتا ہوں، تو داغ کے معشوق کی طرح بھویں تلتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں!

ہمارا سکون اور تبسم دونوں ایک لطیف سے پسینے میں تحلیل ہو گئے۔

جنرل صاحب بولے:

”جب مجھے نو نیوز کے معنی جاننے کی ضرورت ہوگی، تو میں خود پوچھوں گا۔ مگر بغیر پوچھے میں کوئی تشریحات سننے کا عادی نہیں ہوں۔“

جواب میں ریس سر کے علاوہ کیا کہہ سکتا تھا؟ فوج میں یہ ہزاروں جوابوں کا ایک جواب ہوتا ہے۔ اس سے بہتیری بلائیں ٹل جاتی ہیں، لیکن جنرل ریس ایک دوسری قسم کی بلا تھے۔

کہنے لگے:

”تو پھر شجون کی کیا خبر ہے؟“

”سر! کچھ بھی تو نہیں۔ اس طرف سے کوئی بوٹا ہی نہیں۔“

”تم کیا کر رہے ہو؟“

”سر! کان لگائے بیٹھا ہوں، جو نہی....“

○ کسی خبر کا آنا بھی خوش خبری کے برابر ہے۔

”تمناری دو مانگیں بھی ہیں؟“

”یس سر۔“

”پھر دوڑو اور خود جا کر خبر لے آؤ۔“

”یس سر۔“

یہ کہہ کر سلیوٹ کیا اور اسی ہاتھ سے واپسی پر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ دین سے نکل رہا تھا تو جنرل صاحب نے ایک رعایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ”ساتھ ایک دائرلیس گاڑی لے جاؤ اور جہاں بھی کچھ نظر آئے، مجھ سے براہ راست بات کرو، خواہ نوہونہ ہی کیوں نہ ہو۔“ فوج میں ایسی گوشمالی کو رازبری کہتے ہیں اور ہم نے خوب سیر ہو کر نوش کی۔

اب جنرل صاحب ہمیں سینما میں فلم دیکھنے نہیں بھیج رہے تھے بلکہ دشمن کے مورچوں میں اپنی گم گشتہ ٹالین کی خبر لینے کے لیے۔ اور یہ کوئی معمولی پرائیویٹ سا کام نہ تھا بلکہ اچھی خاصی مہلک سی بین الاقوامی مہم تھی۔ حکم سننے ہی ہمیں وہ ہاتھ یاد آئے جو ہمارے بازو پر امام ضامن باندھا کرتے تھے، لیکن جو ہاتھ ہمارے قریب ترین تھے، نائیک ہرنام سنگھ کے تھے۔ سو وہ تسلی بھی میسر نہ ہو سکی؛ چنانچہ قہر لفظیں برجان لفظیں۔ ایک گاڑی لی۔ اس میں دائرلیس سیٹ پہلے ہی سے نصب تھا۔ دو تین آدمی بھی ساتھ لیے اور گاڑی نصیب دشمنان، سوئے دشمنان روانہ ہوئی۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی اور باڑ کے دونوں طرف بارودی سڑنگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کوئی انسان یا گاڑی سڑک سے ذرا بھٹکی اور تار میں الجھی۔ سڑنگ پر پاؤں آیا اور ایک ایک سڑنگ مچھٹی، پھر ایک آن میں تار اور تار میں پھنسنے والوں کا قصہ پاک ہو گیا۔ ہمارا قصہ پاک ہونے کے امکانات اور زیادہ روشن تھے کہ ہم اندھیری رات

میں بٹیاں جلائے بغیر سفر کر رہے تھے اور سڑک کے کنارے ہمیں نظر نہیں آتے تھے۔
یوں سمجھیں کہ ریل کی سڑنگ میں سے ہوائی جہاز اڑا کر لے جا رہے تھے، ذرا دائیں یا بائیں
چھو گیا اور قصہ پاک؟

چلتے چلتے کوئی دو میل گئے ہوں گے کہ سامنے ایک ساکن گاڑی کی پشت دکھائی
دی۔ ”یا خدا! یہ دشمن تو نہیں؟“ ذرا پسینہ چھوٹا، لیکن پیشتر اس کے کہ دریا بہنا شروع ہوتا،
ہمارا ڈرائیور ہنسنا اور بولا:

”جی ایہ تال بھگت سنگھ دی گڈی اے۔“

بلکہ خور سے دیکھا تو گاڑیاں تھیں اور وہی دائر لیس کی گاڑیاں جن کی بھیجی ہوئی خبروں
کے لیے جنرل ریس گوش بر آوازیانی الحال گوش بر ہوا تھے۔ گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے
اس پیمانہ کی وجہ پوچھی تو بولے: ”کپتان صاحب بچھڑ گئے ہیں صاحب آگے آگے جیپ
میں جا رہے تھے، پھر یک لخت غائب ہو گئے۔“

اس مقام سے آگے چار پانچ میل تک NO MAN'S LAND تھا اور ہماری
بٹالین یہ فاصلہ عبور کر کے اُس وقت دشمن سے دست و گریباں تھی۔ گولوں اور گولیوں کی
آوازیں آرہی تھیں، لیکن صحرا کی وسعت میں ان کی سمت یا مقام کا اندازہ مشکل تھا۔ اب نو
نیوز کی وجہ تو معلوم ہو گئی تھی، لیکن حیران تھا کہ جنرل ریس کو کیا خبر بھیجوں۔ اگر سچ بولتا تو ایک
انگریزی محاورے کے مطابق جنرل ریس بہ نفس نفیس ایک بچہ جن دیتے جو ایک جنرل کے
لیے بھی خاصا جو کھوں کا کام ہے۔ دروغ کا مقام نہ تھا کہ سینکڑوں جوانوں کی موت اور
زندگی کا سوال تھا۔

اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ سامنے سے ایک جیپ آکر رُکی۔ یہ کیپٹن کا رتھے۔ ہانپتے

○ مخالف فوجوں کے درمیان کا علاقہ

کانپتے بلکہ روتے دھوتے! ہوا یہ تھا کہ کیپٹن صاحب جاتے وقت پورے سات میل پیچھے دیکھے بغیر نکل گئے تھے۔ جب دشمن سے ٹکر ہوئی اور جنرل صاحب کو کامیابی کی خبر بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو واٹر لیس گاڑی کو آواز دی: کوئی ہے؟ گویا کلب میں بیرے کو بلا ہے ہوں۔ گاڑی کی تلاش میں نکلے، تو پانچ میل پیچھے آنا پڑا اور اب سانس اس لیے پھول ہا تھا کہ پیچھے جنرل ریس دکھائی دے رہا تھا۔

جب مجھ سے کہانی سنی تو سناٹے میں آگئے۔ میں نے مشورہ دیا کہ خبر بہر حال کامیابی کی ہے، خود ہی جنرل صاحب کو سائیں کیپٹن کارنے مائیک ہاتھ میں لیا اور جنرل صاحب سے ابتدائے کلام کی ہم دیکھ رہے تھے کہ کپتان صاحب پر بتدریج ایک غش غالب آ رہا ہے۔ اس غش کے پیچھے جنرل صاحب کا ہاتھ بلکہ زبان کارفرما تھی۔ بہر حال یہ برداشت کرنے کے بعد کیپٹن کارنے کامیابی کی خبر سنائی اور پھر ہم نے ان کے چہرہ پر قطرہ قطرہ رونق آتے دیکھی۔ ظاہر ہے کہ یہ رونق بھی جنرل صاحب کا عطیہ تھا۔

صبح جب بٹالین واپس آئی، تو اپنے ساتھ چند اطالوی اور جرمن قیدی بھی لائی جنرل صاحب نے تمام افروں کو شاباش دی۔ لائن کے آخر میں ہم بھی کھڑے تھے۔ ہم سے ہاتھ ملایا تو مسکرا دیے اور دوسروں کو سنا کر کہا:

”رات ہم دونوں نے بھی ایک چھوٹی سی جنگ لڑی تھی۔“

اس واقعے کے بعد جرمنوں نے ہمیں ذرا زیادہ توجہ کا مستحق سمجھا بلکہ دو ہی دن بعد ہمیں اس قدر توجہ دی کہ ہمارے برگید میں سے جونچ رہنے انہیں جرمنوں کی کم التفاتی کی کبھی شکایت نہ ہوگی۔

روزِ جنگ

۱۹۴۲ء جون ۱۹ء کی صبح طلوع ہوئی تو اُس میں افریقہ کے صحرا اور سیدی رزیغ کی پہاڑی کے لیے کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن سیدی رزیغ کے مورچہ بندوں کے لیے یہ صبح بڑی خاص صبح تھی کہ آج اُن کی موت اور زندگی کا سوال زیرِ بحث آنا تھا، لیکن ذرا پچھلے پہر۔ سردست مشرق سے سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ بازو و جامد صحرا بتدریج ایک تپتے مچھلتے آوے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سیدی رزیغ کے غاروں سے ہمارے برگینڈ ہیڈ کوارٹر کے افسر اور عمدیدار رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر باہر نکلتے تو اپنی برساتیوں سے جو رات کو شبنم کے قطرے جمع کرنے کے لیے بچھا رکھتے تھے، چلو بھر پانی جمع کرتے — ڈوب مرنے کے لیے نہیں، شبنم کرنے کے لیے — یہ شبنم ہم صحرا نوردوں کے لیے من و سلوئی سے کم نہ تھی، ورنہ ہمارے پانی کے راشن پر حجامت کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میں سے کئی ایک نے اپنی داڑھیوں کی بے پناہ یلغار کے آگے اُسترے ڈال دیے تھے اور اچھے خاصے آرچ بشپ نظر آتے تھے۔

ہمارے زمین دوز سگنل آفس سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ کبھی کوئی ڈی۔ آر (یعنی چھٹی رساں) تیز تیز نکلتا اور موٹر سائیکل سنبھال کر ہوا ہو جاتا۔ کبھی اگلے دستوں کے ساتھ

ٹیلی فون کی لائن کٹ جاتی تو فی الفور پانچ چھ جوان پہلے سے تیار کھڑی لاری میں پھٹتے گولوں اور بھڑکتی سرنگوں سے بے پروا لائن کی مرمت کو چل نکلتے۔

دشمن کے مقابلے میں ہماری تین پلٹنیں تھیں۔ گڑھوال رائفلز۔ راجپوت رائفلز اور ساؤتھ ویلز بارڈرز۔ علاوہ ازیں پہاڑی کمین گاہوں میں جا بجا ہمارے توپخانے نے توپیں نصب کر رکھی تھیں۔ اپنے مورچوں کے سامنے ہم نے بارودی سرنگوں اور خاردار تاروں کا جال بھی بچھا رکھا تھا کہ دشمن کو ہمارا مورچہ حاصل کرنے کے لیے ذرا دامن سنبھال کر اور جان کی بازی لگا کر آگے بڑھنا پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ بغیر بازی لگائے ٹھلتے ٹھلتے سیدی رزیغ کی بلندی پر آدھکے اور ہمیں مزاج پُرسی کا موقع ہی نہ دے۔ ہماری سرنگوں سے آگے چند میل بے مالک زمین تھی اور اُس پار فیلڈ مارشل رول کی افواج اور اُس کے بکتر بند ڈویژن تھے۔

فریقین کو ایک دوسرے کی موجودگی کا نہ صرف علم تھا بلکہ کئی روز سے دُور مار توپوں کے ذریعے ایک دوسرے سے علیک سلیک بھی کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ قرآن سے آج جرمنوں کی نیت میں معمول سے زیادہ فتور نظر آتا تھا۔ یعنی یوں جیسے حملہ کرنے والے ہوں۔ ویسے ہماری نیت کا بھی اللہ ہی مالک تھا، لیکن آج ہمیں فقط مدافعت ہی کی توفیق تھی اگرچہ اس مدافعت کے یہ معنی نہ تھے کہ ہم جرمنوں کے خلاف محض پکٹنگ کا ارادہ رکھتے تھے۔ جی نہیں، ہمارے جنرل سٹاف کو گاندھی جی سے نیاز حاصل نہ تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں تو خاصے ظالم پتھر تھے۔ فقط یہ کہ جنگی ضرورت کے تحت اُن کا استعمال صرف اسی صورت میں کرنا تھا کہ جرمن پہلے اینٹ پھینکیں۔ اور یہ اینٹ بالآخر پچھلے پہر نازل ہوئی۔

میں برگائیڈ گنل آفس میں بیٹھا تھا۔ — یہ آفس — ایک گھر سے غار میں تھا۔

کہ اچانک ہمارے ہراول دستوں نے دائر لیس پر جرمن حملے کی خبر دی۔ حسب معمول حملے کی ابتداء شدید گولہ باری سے ہوئی۔ جواب میں ہماری توپوں نے بھی ماحضر پیش کیا۔ جب یہ باہمی

تواضع ذرا زور پکڑ گئی، تو مختلف یونٹوں سے جنگی حالت کے متعلق ٹیلیفون اور وائرلیس کے ذریعے پیغام آنے لگے۔ دو چار ہی پیغام پڑھے تو محسوس ہوا کہ کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں۔ مجھے وہ لمحہ کبھی نہ بھولے گا جب وائرلیس پر ہمارے برگائیڈ کے پہلے جوان کے مرنے کی خبر آئی۔ یہ ہمارے توپ خانے کا ایک گولہ انداز تھا۔

جنگ کے دوران عموماً وائرلیس پر خفیہ زبان یعنی سائیف یا کوڈ میں پیغامات بھیجے جاتے ہیں جو بعض اوقات محض اعداد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ دشمن بات نہ سمجھ لے، لیکن جب لڑائی کا یہ عالم ہو کہ دست و گریبان کا معاملہ ہو تو پوشیدگی کا تکلف برطرف رکھ دیا جاتا ہے، وہ صاف ستھری انگریزی میں اطلاعات اور احکامات آنا جانا شروع ہو جاتے ہیں؛ چنانچہ لفظ جملہ جنگی حالت کی خبریں آتیں کہ دشمن کے ٹینک اس پہلو سے بڑھ رہے ہیں یا فلاں مقام پر توپ کا فائر تیز ہو گیا ہے یا ہمارے اتنے آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔ ملک کی فلاں جگہ ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام اطلاعات خفیہ زبان کی بجائے سنگی انگریزی میں وائرلیس پر آتیں۔

لیکن ایک مرتبہ ہمارے ایک یونٹ کمانڈر کو جنگی چال کے سلسلہ میں نہایت راز کی بات کہنا تھی اور فی الفور کوڈ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ صاف انگریزی میں بات کرتا تو قیامت ٹوٹ پڑتی۔ لہذا اپنی گوراشاہی اُردو میں بولنے لگا جسے ایک گوراشاہی سمجھ سکتا تھا اور جو جرموں کے فہم سے بہت بالا تھی۔ ادھر ہمارے برگائیڈ کمانڈر نے بھی اُردو میں جواب دیا اور عارضی طور پر یہ اڈا چل گیا۔ ہم نے یہ قصہ سنا تو سینہ فخر سے تن گیا اور کئی دن تیار رہا۔

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(اگرچہ یہاں اُردو دھوم مچانے کے لیے نہیں دھول ڈالنے کے لیے استعمال کی گئی تھی، ہمارا برگائیڈ پہلی مرتبہ جنگ لڑ رہا تھا۔ دشمن کی دُور مار توپوں کے گولے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے اور ایسا کرنے میں ہمیں زندگی بھر کے لیے ممنون کر رہے تھے کیونکہ

وہ دراصل ہمارے استفادے کے لیے ہی پھینکے جا رہے تھے اور اگر سر سے گزرنے کی بجائے وہیں نازل ہو جاتے تو ہم نہ صرف مستفید ہوتے بلکہ متوفی بھی۔ ویسے ان گولوں کو ہم تک پہنچنے کے لیے غار کی چھت چیرنا پڑتی اور اتنی زحمت کے بعد انہیں ہم تک رسائی ہو جاتی تو مرنا غار بھی نہ تھا۔ یہ بھی اطمینان تھا کہ اکیلے نہ مریں گے۔ بہت سے یارانِ غار کی رفاقت حاصل تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس غار کی گہرائی میں ہم بے حد محفوظ تھے۔

ہمیں رہ رہ کر ان جوانوں کا خیال آتا جو کھلمیدان میں ہم سے دو میل آگے توپوں اور مشین گنوں کی زد میں بیٹھے تھے۔ ان کی سپرہِ فلاسفی تھی کہ اگر اس گولے پر ہمارا نام نہیں لکھا تو ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اور اگر لکھا ہے تو چھپنے کا فائدہ نہیں۔ یہ ہے بہادروں کی فلاسفی۔ لیکن اس فلسفے کا ذکر کرنا آسان ہے، اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ یارانِ غار تقریباً سب کے سب ذاکر تھے۔ عامل آگے تھے۔ ادھر رات بھر دشمن گولے برساتا رہا، لیکن اپنے مورچوں سے نکل کر ہماری طرف نہ بڑھا۔ ہماری افواج تو خیر تھیں ہی دفاعی مورچوں میں اور دشمن کی طرف پیش قدمی کرنے کا ہمارا ارادہ تھا نہ امکان۔

امن کے زمانے میں اس لُت و دق صحرا کی راتیں کس قدر خاموش اور بے ہنگامہ ہوتی ہوں گی جہاں سینکڑوں میلوں تک کہیں آبادی کا نام نہ تھا۔ جہاں سیدی رزلیخ، اللدوۃ، العدم وغیرہ محض بے جان ٹیلوں یا گھاٹیوں کے نام تھے۔ لیکن اب اس مُردہ ریگستان کی تمام تر پہنائی رنگ و صوت کے وحشت خیز ہنگاموں سے بھر پور تھی۔ صوت : وہ توپوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ جو کبھی اس قدر دُور کہ خواب معلوم ہوتا اور کبھی اس قدر قریب کہ ٹیلے کی اوٹ لینے کو جی چاہتا۔ رنگ : وہ روشنی کے سُرخ و سپید گولے جو ہر دو جانب سے مخالف افواج کو دیکھنے یا اپنی افواج کو اشارہ کرنے کی غرض سے چھوڑے جاتے اور وہ سرچ لائٹ کی لمبی روشن انگلیاں جو آسمانوں کی دسمتوں کو چیرتی ہوئی مخالف طیاروں کا تعاقب کرتیں۔ یہ ات

تقریباً ساری کی ساری آنکھوں میں کٹی۔ لیٹنے کو ایک پل بھی نہ ملا اور بلتا بھی تو اسے لیٹ کر گزارنے میں کچھ خوبی نہ تھی کہ ان حالات میں سخن گستاخانہ بات بند نہ تھی بلکہ خود زندگی تھی اور زندگی بیداری اور حرکت سے عبارت ہے۔ اگر سو جاتے تو شاید سحر ہی نہ ہوتی۔

صبح ہوئی، تو جنگ بدستور جاری تھی۔ لیکن نہ دشمن آگے بڑھا تھا اور نہ ہم نے موڑے خالی کیے تھے۔ ہمارا جانی نقصان بھی ہلکا سا تھا لیکن جو کھٹکا ہمیں مسلسل لگا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ سیدی رزیغ کے جنوب میں سینکڑوں میلوں تک صحرا ہی صحرا تھا اور ہمیں ڈرتھا کہ دشمن کہیں ہم سے آنکھ بچا کر دور جنوب سے بڑھ کر مشرق میں ہماری پسپائی کا راستہ نہ کاٹ دے لیکن ہماری سادگی دیکھیں کہ ہم اس ناگوار امکان کا محض ذکر ہی کرتے رہے اور جرموں نے اس پر عمل بھی کر دیا یعنی تمام دن ان کی توپوں نے ہمیں جیسے باتوں میں لگائے رکھا اور چپکے سے ان کا مشورہ لائٹ آرمر ڈویژن بہت دور جنوب سے ایک قوس کی شکل میں مشرق کو ہمارے مقدم کے لیے بڑھنے لگا۔ کوئی غروب آفتاب کا وقت تھا کہ ہماری ہائی کمان پر جرم چال کا انکشاف ہوا اور فوراً ہمارے برگئیڈ کو سیدی رزیغ چھوڑ کر سلوم کی طرف پسپائی کا حکم ملا۔

اب پسپائی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو نہی حکم ملا، ہر سپاہی اور افسر نے سر پر پاؤں رکھ کر پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ پسپائی ایک نہایت ہی دقیق جنگی چال ہے۔ اس میں ہر یونٹ ہر سیکشن بلکہ ہر جوان کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک خاص وقت پر اپنی جگہ چھوڑنی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ کسی دوسری طرف سے دشمن پر گولہ باری شروع کر دی جاتی ہے کہ وہ پسپا ہونے والے یونٹ کو جگہ خالی کرتے دیکھ کر اس پر پل نہ پڑے۔ اپنے اور دشمن کے درمیان ہمیشہ فاصلہ رکھا جاتا ہے اور مختلف یونٹ ایک دوسرے کو حفاظتی فائر دے کر پیچھے ہٹتے ہیں۔ اس طرح مکمل برگئیڈ کو پوزیشن خالی کرنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ ہمارے برگئیڈ ہیڈ کو اڑنے لگے۔ جس میں یہ خاکسار بھی

شامل تھا۔ — پپائی کی ابتداء کی۔ کوئی دس بارہ گاڑیوں کا ہلکا پھلکا سا کاناڑا تھا۔ ادھر
 ساحلی سڑک بچتے بھی تھی اور سیدھی بھی۔ اور ہماری فلاح کا تقاضا تھا کہ اس صراطِ مستقیم پر جس تیزی
 سے بھاگ سکیں بھاگیں۔ — چنانچہ بھاگنا شروع کر دیا۔

بھاگتے ہوئے ہمارے شمال میں بحیرہ فلزم تھا اور جنوب میں جرمن۔ فلزم سے تو
 ہمیں ایسی دلچسپی نہ تھی لیکن جرمنوں سے ہمارا بہت سا مفاد وابستہ تھا؛ چنانچہ ہماری آنکھیں
 اُن کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ دفعۃً جنوب میں ہمیں روشنی نظر آئی اور ہماری دنیا تاریک ہو
 گئی، کیونکہ یہ روشنی اُن گولوں کی تھی جنہیں جرمن دستے فضا میں بلند کرتے ہوئے ہماری پیشانی
 کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ تیزی میں آکر ہمارا ایک ٹرک صراطِ مستقیم سے بھٹک کر
 ریت میں پھنس گیا۔ ہمیں گمراہ ٹرک کو راہِ راست پر لانے کی فرصت نہ تھی۔ اسے وہیں رہنے
 دیا اور سواریوں کو دوسری گاڑی میں بٹھا کر فرار جاری رکھا اور آخر دشمن کے پنجوں سے انچوں
 کے حساب سے بچ نکلے۔

اب برگئیڈ ہیڈ کو اڑنے تو فلاح پالی تھی، لیکن خود برگئیڈ کا کیا حشر ہونے والا تھا؟
 اور وہ محض چند بلکی پھلکی گاڑیوں کا کاناڑا نہ تھا، بلکہ سینکڑوں بھاری بھرم لاریوں کا کارواں
 تھا جو تین ہزار جوان اور قیمتی اسلحے کے ترنگ صحرائی سڑک پر رنگتارنگ چلا آ رہا تھا اور جس کے
 استقبال کو جرمن توپیں دہانے کھولے کھڑی تھیں۔ — دل ہزار دوسوسوں کی آماجگاہ تھا۔
 ”یا اللہ! ہمارے ساتھیوں کا کیا بنے گا؟ کھلی لاریوں میں بیٹھے وہ کوئی مدافعت بھی تو نہ کریں
 گے۔ کیا وہ سارے موت کے منہ میں آ رہے ہیں؟“

ہم رات بھر جاگتے اور بھاگتے رہے۔ کوئی تین بجے شب کا عمل تھا کہ اچانک ہمیں
 سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے قریب اوٹ میں آگ جل رہی تھی جس پر

چائے کی کیتلی رکھی تھی اور تین چار جوان آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ ہم نے گاڑی ٹھہرائی۔ انجن کا شور بند ہوا تو اچانک ماہیے کی ایک سڑبلی آواز کان میں پڑی :

”پنڈیوں آئی لاری۔ میں تینوں ہوڑ رہیاں، پردیس نہ لائیں یاری“

جس پردیس اور جس برگیڈ میں ہم تھے، اُس میں یاری لگانے کے امکانات تو ایسے روشن نہ تھے، لیکن ماہیے کی آواز سُن کر دل حزیں نے پہلو بدلا۔ یوں محسوس ہوا جیسے چکوال آنکلیے ہوں۔ ان جوانوں کی بے پناہ SENSE OF HUMOUR (حسنِ ظرافت) پر تعجب ہوا کہ جہاں دوسرے لوگ جان بچانے کے لیے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں، یہ من چلے پردیس کی یاری کے گیت گارہے ہیں۔ ہمیں رکتا دیکھ کر ایک جوان آگے بڑھا اور بولا :

”صاحب چائے پیو گے؟“

ہم رات بھر کے بھوکے پیاسے بھاگ رہے تھے اور پھر اس پیار سے نیش کی ہوئی چائے سے انکار کس کافر کو ہوتا؟ ایک پیالی پی تو شکست کا غم کم ہو گیا۔ چلتے ہوئے خالص دھنی کے لہجے میں خدا حافظ کہا تو آواز آئی کہ صاحب تو گرائیں معلوم ہوتا ہے۔ جی تو چاہا کہ دو گھڑی ان دو عالم سے بیگانہ بہادروں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں، لیکن کارواں کے آداب مانع تھے۔

صبح دم سلوم پہنچے اور بے تابی سے اپنے ساتھیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر میس کے عملے نے فوراً بارگاہ کھڑی کی۔ یعنی میس کے خمیے نصب کیے اور میز پر ناشتہ چُنا۔ برگیڈ کمانڈر صاحب مع دوسرے افسروں کے کھانے پر آ بیٹھے۔ مجھ پر نگاہ پڑی، تو ارشاد ہوا کہ ”دیکھو برگیڈ کے باقی یونٹ آنے ہی والے ہیں۔ تم جلد جلد ناشتہ کر لو اور ان یونٹوں کے

○ چکوال اور اس کے ارد گرد کا علاقہ دھنی کہلاتا ہے۔

● ایک ہی گاؤں کے رہنے والے۔

آنے سے پہلے ہی ان کی لائٹوں تک ٹیلی فون لگوانے کا انتظام کرو تا کہ فی الفور سلسلہ مواصلات شروع ہو سکے اور مجھے نقتے پر ان یونٹوں کی جائے قیام دکھائی۔

میں نے چائے کی پیالی پی اور جلد جلد ڈوٹیرنل ہیڈ کوارٹر میں گیا کہ پندرہ بیس میل تار حاصل کروں۔ ہمارے اپنے برگید کے تار تو سیدی رزیغ کی گھاٹیوں میں ہی بکھرے رہ گئے تھے۔ عام فوجی مشقوں میں کوچ سے پہلے تار لپیٹ لیا جاتا ہے کہ دوبارہ استعمال ہو سکے، لیکن گزشتہ شب کے کوچ میں ہم مشکل اپنے آپ کو لپیٹ سکے تھے اور ہمارے ٹیلی فونوں اور تاروں نے ہر چند کہ لمبے ہاتھ کر کے فریاد کی تھی کہ ہمیں بھی ساتھ لیتے جائیے، لیکن ہم مڑ کر ان پر حسرت کی نگاہ بھی نہ ڈال سکے تھے کہ ہمارا کوچ سراسر رضا کارانہ نہ تھا، اس میں جرموں کی طرف سے کچھ شائبہ جبر بھی تھا۔

ڈوٹیرنل ہیڈ کوارٹر سے تار مانگا تو جواب ملا:

”کیا کرو گے تار کو؟“

عرض کیا: ”یہ سچے سے تین ٹالین اور توپ خانہ آرہے ہیں۔ ان کے اور برگید کے

درمیان ٹیلی فون لگانا ہے؟“

ارشاد ہوا: ”تم نے خبر نہیں سنی؟“

انداز سوال سے ظاہر تھا کہ خبر اچھی نہیں۔ تفصیل پوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ خدا جانے

ہمارے ساتھیوں پر کیا گزری تھی۔ بیم درجا کے عالم میں اس کا منہ تکنے لگا۔ میری دماغی کیفیت

غالب کے قیدی پرندے سے مختلف نہ تھی جس نے نو گرفتار ساتھی سے روداد چمن پوچھتے

ہوئے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دی تھی کہ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آتیاں کیوں ہو۔

اور جب روداد چمن سنی تو معلوم ہوا کہ سچ ٹیج نہ بجلی اپنے آتیاں پر ہی گری تھی تفصیل

سن کر سکتے میں آگیا۔ ہوا یہ تھا کہ ہمارے سچ نکلنے کے بعد دشمن نے سڑک پر ایک روڈ بلاک لگا

لیا اور تمام تر اسلحہ سے لیس ہو کر ہمارے برگیڈ کا انتظار کرنے لگا اور جونہی ہمارے لاری سوار
 جوان قریب آئے۔ کم بخت نے گزروں کے فاصلہ سے اُن پر گولہ اور بارود کی بارش کر دی۔
 بیشمار سپاہی لاریوں کے اندر مارے گئے۔ جو نیچے اترے وہ وہیں ڈھیر کر دیے گئے۔ فرداً فرداً
 یہاں بھی ہمارے جوانوں نے بہادری کا ثبوت دیا۔ ایک جوان کو ٹامی گن سے جرمن ٹینک پر
 حملہ کرتے دیکھا گیا۔ کئی ایک سنگینیں تان کر جرمن مشین گنوں پر پل پڑے، لیکن یہ جوش دشمن کو مارنے
 کے لیے نہیں تھا، صرف عزت سے مرنے کے لیے تھا۔ تقریباً نصف سے زیادہ برگیڈ تباہ ہو
 گیا۔ سینکڑوں جوان مارے گئے یا قید کر لیے گئے۔

اس شکست کا بدلہ آخر ہمارے چوتھے ڈویژن نے لیا جس نے آٹھویں فوج کی ہلچل
 میں جنرل منٹگمری کی قیادت میں حصہ لیا۔ لیکن جنگ کی درشتی کا صحیح احساس فتح
 میں نہیں، شکست میں ہوتا ہے اور ہمارا جنگ کا پہلا تجربہ ایک مکمل شکست اور طویل پسپائی
 تھی جو فوجی نقطہ نگاہ سے ایک ناقابل فراموش اور قیمتی سبق تھا۔
 میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

Handwritten text, likely a title or header, appearing as a faint line of script at the top of the page.

Handwritten text, appearing as a faint line of script below the header.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script.

Handwritten text, appearing as a faint line of script at the bottom of the page.

پسپانی بسوئے مینا کیمپ

اب سلوم میں ٹھہرنا بے معنی تھا۔ جنرل ہیڈ کوارٹر قاہرہ سے حکم آیا کہ چارپانچ روز میں برگائیڈ کے پس ماندگان اکٹھے ہوں تو نرسوز کے قریب ایک بیس کیمپ (BASE CAMP) میں بھیجے جائیں اور وہاں انہیں توڑ پھوڑ کر اور مزید ملک شامل کر کے ایک نیا برگائیڈ کیمپ کیا جائے۔ خود ہمیں تو توڑنے پھوڑنے کی حاجت نہ تھی کہ ہم پہلے ہی خاصے کو بیڈ و مالیدہ تھے۔ سیدی رزیغ کے دنوں میں جرمن حملے کے ساتھ خود ہمارے گلے نے بھی بغاوت کر دی تھی۔ گلے کی تکلیف خاصی تھی لیکن صرف ٹانسلاٹس ہی تھا جو جرمن ٹانس کے مقابلے میں گدگری معلوم ہوتا تھا۔ اب جرمنوں سے تو سلوم میں امان مل گئی تھی، لیکن اپنے گلے سے گلو خلاصی کے لیے ہسپتال درکار تھا۔ ہر چند کہ ہمارے برگائیڈ میں ایک فیلڈ ایمبولینس اور اس کے ڈاکٹر بھی تھے جو ہمارے قریب ہی خیمہ زن تھے اور میں اولین فرصت میں ان کے پاس گیا بھی، لیکن دیکھا تو ڈاکٹر لوگ سیدی رزیغ کی شکست کے بعد اپنے جگر کے چاک ہی رفونہ کر پائے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی حالت دیکھ کر یہ خاکسار اپنے گلے کا دکھ بھول گیا۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے!

ہمارے گلے کے علاج کے لیے قریب ترین ہسپتال بصلی تھا جو اسکندریہ کی بصلی میں
بحیرہ روم کے کنارے واقع تھا، یعنی کوئی تین سو میل پیچھے مشرق کو؛ چنانچہ ہمیں حکم ملا کہ جس قدر
جلد ہو سکے، بصلی کے ہسپتال میں پہنچو۔

اب سلوم اور بصلی کے درمیان کوئی بس تو چلتی نہ تھی کہ ٹکٹ لے کر بیٹھ جاتا۔ جنگ
میں مقام الف سے مقام ب تک جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی HITCH-HIKE
اپنا مختصر سا اثاثہ لے کر جو ایک فوجی تھیلے پر مشتمل تھا، سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور مشرق کی
طرف جاتے ہوئے پہلے ٹرک کو ہاتھ دیا۔ یہ صحرائی جنگ کے آداب میں سے تھا کہ کوئی سپاہی
سواری کا محتاج ہو تو اسے شناخت کے بعد بلا تامل جگہ دی جائے۔ ہم نے ڈرائیور کو اپنا شناختی
کارڈ دکھایا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ٹرک کو صرف مرسی مطروح تک ہی جانا تھا۔ اس مشہور صحرائی چھاؤنی میں پہنچے تو
دیکھ کر حیرت بلکہ عبرت آنے لگی ٹیکسٹ واقعی نامراد شے ہے۔ مرسی مطروح ہم نے جاتی
مرتبہ بھی دیکھا تھا۔ کیا چہل پہل تھی! وہ آبادیوںٹ، وہ شاداب میں، وہ آسودہ چہرے اور وہ
بیہودہ گپیں۔ مرسی مطروح زمانہ امن میں ایک اطالوی چھاؤنی تھی، قد کے لحاظ سے چھوٹی
سی، مگر آسائشیں بڑی بڑی میسر تھیں۔ اطالوی افسروں اور سپاہیوں کے متعلق مشہور تھا کہ جنگ
کے علاوہ ہر فن میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان کے دیگر کمالات کی پڑتال کا تو ہمارے پاس وقت
نہ تھا، لیکن فن تعمیر میں انہیں واقعی یکتا پایا۔ کم بختوں نے صحرا کو بہشت میں بدل دیا تھا۔
مرسی مطروح کو تو جانے دیں کہ زمانہ امن کی پیداوار تھا۔ عین جنگ اور عین صحرا
میں بھی یہ خوش مذاق اطالوی اپنے مورچے اس نفاست سے کھودتے تھے گویا تاج محل تعمیر کر
○ اس انگریزی ترکیب کا غالباً کوئی ترجمہ نہیں۔ اگر آپ نے انگریزی نہیں پڑھی تو کوئی ہرج
نہیں پڑھتے جانیئے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔

رہے ہوں اور اطالوی افسروں کے لوازماتِ زندگی کے پیش نظر شاید محلات کی ضرورت بھی تھی۔ یہ پچھلے سال ہی کی تو بات تھی کہ جب ہمارے جوانوں نے اطالوی مورچوں کو جادو بوجا تو اندر سے جہاں ہر اطالوی افسر ہاتھ بلند کیے باہر نکلا وہاں ساتھ ہی ایک جوان لڑکی بھی ہاتھ کر پر رکھے برآمد ہوئی۔ غنیمت کے اس مالِ لطیف نے شروع میں تو کچھ عجیب مسائل پیدا کر دیے کہ ہماری فیلڈ بک میں اس موضوع پر کوئی ہدایات نہ تھیں، لیکن جلد ہی ہمارے کمانڈر کے حُسنِ مذاق نے اس کا واحد تسلی بخش حل ڈھونڈ نکالا۔

ذکرِ مری مطروح کی بے رونقی کا تھا۔ صرف چند ہفتے پہلے مطروح کا ہر گوشہ کفِ گل فروش تھا، مگر اب کہ ہر لحظہ رومل کے حملے کا ڈر تھا، اس کے گلی کوچوں میں ہر چند قدم پر بخار دار تار کے دیو قامت گولے لڑھکا دیے گئے تھے جن سے دست و پا ہی نہیں دیدہ و دل بھی مجروح ہوتے تھے۔ سپائی کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور جنگ میں سپائی سے زیادہ یاس انگیز کوئی چیز نہیں ہوتی۔ محافظینِ مطروح بے مضمحل نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں رات کو میٹھی نیند یا سہانے خوابوں کی توقع بیکار تھی؛ چنانچہ جوں توں کر کے مری مطروح میں ایک افسردہ سی رات گزاری۔ دوسرے دن علی الصبح بسترِ باندھا اور اس حسرت کدے سے نکل کر لاریوں کے رگڈر پر آ بیٹھے اور کافی دیر بیٹھا کیے۔ اٹھائے جانے کا تو خوف نہ تھا کہ کوسوں تک دیر تھانہ حرم، دیر تھانہ آساں، بالآخر مغرب سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کی منزلِ العالمین تھی۔ اسی میں بیٹھ گئے اور العالمین پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔

العالمین میں صرف ایک یونٹ تھا اور وہ بھی چھوٹا سا۔ رات ان کے ساتھ بسر کی۔ ان دنوں العالمین ایک غیر معروف سا مقام تھا اور ابھی یہ بات اس سنان سے قریب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ صرف چند ہی ماہ بعد منٹگرمی اور رومل اسے تاریخ کے صفحات میں دوام بخش دیں گے۔ بہر حال ہم نے العالمین کی رہائش کا تاریخی فخر العالمین کے زمانہ تا قبل

تاریخ میں ہی حاصل کر لیا۔

دوسرے دن علی الصبح اسکندریہ جاتے ہوئے ایک اور فوجی ٹرک مل گیا اور شام کو ہمیں بھیلی کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز فی الفور ہمارے گلے کا آپریشن کر دیا جائے گا، لیکن ڈاکٹر صاحب نے دیکھا تو گلے میں ذرا سا پینٹ لگا دیا اور فرمایا کہ ہفتہ بھر غرارے کرو اور اسی دن ڈسچارج کر کے قاہرہ ری انفورسمنٹ کیمپ میں بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے زبان سے تو نہ کہا، لیکن ان کا مطلب واضح تھا کہ جنگ جاری ہے۔ محض گلے کی خرابی سے تیمارداری کی عیاشی نہیں کرائی جاسکتی۔ ابھی جنگ لڑو۔ بچ گئے تو گلے کا علاج ہوتا رہے گا اور کام آگئے تو فرشتے تمہارے لیے بہشت یا دوزخ کا فیصلہ گلا دیکھ کر نہیں کریں گے۔ قصہ کوتاہ دوسرے روز ہم قاہرہ کے قریب ری انفورسمنٹ کیمپ میں پہنچ گئے۔ سرکاری مقصد یہ تھا کہ ایک ہفتے کے آرام کے بعد ہمیں حسب ضرورت ججگی استعمال میں لایا جائے۔

قاہرہ کا یہ مشہور ری انفورسمنٹ کیمپ مینا کیمپ کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ اسی نام کے علاقے میں قاہرہ شہر سے کوئی دس میل دور اہرام مصر کے سائے میں واقع تھا۔ کیمپ میں پہنچے تو اس کے حسن انتظام کا فوری احساس ہوا۔ گاڑی سے اترنا تھا کہ ایک صوبیدار صاحب مع چند سپاہیوں کے استقبال کو بڑھے۔ فی الفور ہمارا سامان خیمے میں پہنچایا گیا اور خود ہماری ٹہل تک رہنمائی کی گئی۔ خیمے کے دروازے پر ایک سیاہ فام مگر صاف ستھرا ادھیڑ عمر کا متمہ سپاہی کھڑا تھا۔ بولا:

”میں سپاہی بابورام ہوں، آپ کا اردلی۔“

خیمے کے دروازے سے بابورام کا ظہور اس قدر اچانک ہوا تھا جیسے الدین نے چراغ رگڑا ہوا اور دھوئیں سے ایک لاغر سا جن نمودار ہوا ہو۔ بابورام نے ایک خاص اردلیانہ ادا سے

پتی اٹھائی اور ہم خیمے میں داخل ہوئے۔

کیا ستھرا اور کشادہ خیمہ تھا! درمیان میں پلنگ، ادھر لکھنے کی میز اور کرسی اُس طرف ڈرینگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری۔ خیمے کے سامنے کی دیوار میں دروازہ تھا۔ پردہ اٹھایا تو ایک دوسرے مگر چھوٹے سے خیمے میں کھلا۔ اندر کی چیزیں دیکھیں تو محسوس ہوا خواب دیکھ رہا ہوں۔ تین بالٹیاں بظاہر پانی سے بھری پڑی تھیں۔ سہمے سہمے ہاتھ لگایا تو سوچ مچ پانی تھا۔ صحرا کی جنگ کے بعد ہمیں چلو بھر سے زیادہ پانی یکجا دیکھنے کی توقع نہ تھی۔ اب نہ صرف بالٹیوں پانی موجود تھا، بلکہ اس کے استعمال پر اختیار بھی تھا۔ بے اختیار اپنی خوش نصیبی پر کسی واضح ڈھنگ سے ناز کرنے کو جی چاہا۔ مثلاً ایک والمانہ رقص سے جیسے ہٹلر نے فتح فرانس کی خبر ملنے پر کیا تھا، مگر پیچھے اردلی دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے رقص کرنے میں اپنے عہدے کی سطوت مانع آئی! دہتلر عہدے کے لحاظ سے ہم سے بہت جو نیئر تھا۔ وہ کارپول ہم نیم لفٹین! لہذا ناچ سے تو گریز کیا، لیکن آنا فانا کپڑے اتارے اور ایک انتہائی سرور انگیز غسل سے داد عیش دی۔ بعد کی زندگی میں اس سے زیادہ مکلف غسل بھی کیے، مگر وہ سرور نہ حاصل ہو سکا کیونکہ پھر کبھی مہینہ بھر باہم زندگی بسر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

غسل ہو چکا تو اردلی ایک صاف سُتھری ٹرے میں چائے رکھ کر لایا۔ ساتھ بسکٹ اور سیب بھی۔ یعنی یہ سب تکلف اُس شخص کے لیے ہو رہا تھا جو کل تک بلی بیف بشمول ریگ صحرا پر گزارا کرتا تھا۔ اپنی خوش بختی پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ کہیں کسی کلرک کی غلطی سے ہمارا نام نیم لفٹینوں کی بجائے جرنیلوں کے خانے میں تو نہیں لکھا گیا تھا؟ بہر حال ایسی غلطی اگر کہیں ہوئی بھی تھی تو اُس کا پکڑنا کسی جرنیل کا کام تھا۔ بالفعل ہمارا کام اس چائے کو پینا تھا، دھیرے دھیرے پینا تھا اور جی بھر کر پینا تھا۔

چائے کے دوران اردلی سے مزید تعارف ہوا۔ معلوم ہوا مدراس کا رہنے والا ہے۔

ہماری طرح جنگ کی ابتداء میں بھرتی ہوا اور اپنے کمالات کے مظاہرے کے لیے کیڑنگ کور کا انتخاب کیا یعنی فوجی میسوں اور لنگر خانوں میں خدمت کرنے لگا۔ شکل و صورت سے بابورام پیدائشی خدمتگار نظر آتا تھا۔ اس کے اردلی پن میں گویا مشیت ایزدی جھلک رہی تھی۔ کارِ خدمت میں دُور شوق اور محنتِ شاقہ میں خندہ پیشانی، یہ مشیت ہی کا توفیق تھا۔ بابورام نے ہمیں پہلی ملاقات پر ہی رام کر لیا۔ باتوں باتوں میں بولا:

”صاحب، شام کو کیا کھائیں گے؟“

اب کھانے کے معاملے میں میسوں میں رہنے والوں پر مختاری محض تہمت ہے جو خداوندانِ میس چاہے ہیں، سو کرے ہیں۔ ہم نے کہا:

”بابورام، جو میس میں پکے گا، کھانا پڑے گا اور کھائیں گے۔ ہماری پسند کیا معنی؟“

بولا: ”اگر اجازت ہو تو آپ کے لیے علیحدہ مدراسی دال پکا لاؤں؟“

اب مجھے بابورام کی دال کھانے کا ایسا شوق نہ تھا، اس لیے نہیں کہ ایک ہندو کے پکے ہوئے کھانے سے میرے اسلام کو کچھ خطرہ تھا۔ آفیسرز میس میں کوئی ملازم رنگ یا مذہب کے اعتبار سے اچھوت نہ تھا۔ مجھے اعتراض تھا تو دال پر۔ کیونکہ دال سے میرا اسلام واقعی خطرے میں تھا۔ مجھے ہمیشہ خدشہ رہا ہے کہ اگر مسلسل دال کھائی جائے تو مسلمانی زائل ہو جاتی ہے۔ بہر حال بابورام کی دل شکنی منظور نہ تھی۔ کہا: ”پکا دال“

بابورام نے کہا: ”شام کا کھانا میس کی بجائے خیمے ہی میں کھائیے گا۔“

یہ مزید عیاشی تھی۔ دعوتِ قبول کی اور ایک آسودگی اور فراغت کے احساس سے

خیمے سے باہر نکلے کہ تھوڑی سی مینا کیمپ کی سیر ہی کر لیں۔

بصرے والے شائبہ کیمپ کی طرح مینا کیمپ بھی ایک شہر تھا جس کے مختلف حصے

تھے۔ برطانوی ونگ، ہندوستانی ونگ، پلٹن کا محلہ، توپخانے کا محلہ وغیرہ وغیرہ کیمپ میں

ہندوستانی افسروں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ اُن سے ملاقات ہوئی تو گفتگو قاہرہ اور اس کی دلچسپیوں کے گرد ہی گھومتی رہی۔ جسے دیکھو فذائے قاہرہ۔ کوئی گراپی کا دلدادہ۔ کوئی بادیہ کا شیدائی۔ کسی پرکانٹی نینٹل کا جادو اور کوئی شپہ ڈاکا پرستار۔ ان جگہوں کی رنگینیوں کے قصے کچھ اس اشتعال انگیز انداز میں سنائے گئے کہ اسی ساعت قاہرہ کی سمت ہوا ہو جانے کو جی چاہا۔ اور قاہرہ کوئی دور بھی نہ تھا یہی دس بارہ میل۔ سڑک پر کھڑے ہو جاتے تو کوئی گاڑی یا کسی قاہرہ جاتی ہوئی مل ہی جاتی۔ مگر یہ کہ کیمپ کے کمان افسر سے رخصت لینا لازم تھا اور ہم نے بھی مشکل اپنی آمد کی رپورٹ دی تھی۔ سو قاہرہ جانا کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھا۔

کیمپ دیکھتے دیکھتے شام ہو گئی۔ اپنے خیمے کو نوٹے۔ اندر داخل ہونے کے لیے جی اٹھانا چاہی تو وہ خود بخود اٹھ گئی۔ دیکھا تو جی کے پردے میں بابورام بول رہا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو خیمہ جگمگا رہا تھا۔ بابورام نے سرکاری بلب کے علاوہ ایک غیر سرکاری بلب بھی لگا دیا تھا اور ہماری غیر حاضری میں ایک چھوٹا سا قالین بھی پیدا کر لیا تھا، مینر پر ایک گلدستہ سجا دیا تھا اور ساتھ تپائی پر مشروبات کی بوتلیں اور بلور کے جام چن دیے تھے۔ ایسا بندوبست ہم نے پشاور چھاؤنی میں بھی کم دیکھا تھا۔ ہماری دشت پیمائی کا صلہ دینے کے لیے سچ مچ کوئی فراخ دل بلکہ فضول فرج فرشتہ مقرر ہوا تھا۔ پھر دفعۃً بابورام نے جیسے ہمارے دل کے اندر جھانک لیا ہو۔ آگے بڑھ کر وہی مشروب تیار کیا جو ہمارے دل میں تھا اور ہم ایک نچتہ اور فرانت جرنیل کی طرح اُسے جرہ جرہ پینے لگے۔ بابورام اس خاموشی سے غائب ہوا کہ ہمیں احساس تک نہ ہونے دیا۔

کوئی آٹھ بجے کا وقت ہو گا کہ بابورام خیمے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک قاب تھی۔ ہمارے سامنے رکھ کر اوپر سے پردہ سرکایا، تو مانوس انگریزی کھانے کے پہلو بہ پہلو ایک سبز مرچوں میں ملبوس پلیٹ نظر آئی۔ یعنی بابورام کی تخلیق مدہی

داں! لیکن گہری سبز اور تلخ مرچوں کی دید سے ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کا تار چھو لیا ہو۔ بابورام ہماری سرایتگی دیکھ کر بولا:

”داں مرچوں کے نیچے ہے۔ آپ صرف داں بھی کھا سکتے ہیں، لیکن مرچوں کا بھی

ساتھ رہنے تو دو آتشہ ہو جائے گی۔“

دل سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک آتشہ پر ہی اکتفا کرنا قرین مصلحت ہے؛ چنانچہ

مرچوں سے قطع نظر کر کے بابورام کی داں سے بسم اللہ کی۔ پہلے لقمے کے ساتھ ہی ہمارے اندر

زندگی نے کروٹ لی۔ بخدا یہ داں مونگ نہ تھی، داں حیات تھی۔ اُس شب ہم نے انگریزی

کھانے پر ہر چند کہ توجہ دی، کم دی۔ اور اس کے بعد جتنے دن مینا کیمپ میں رہے، بابورام

کی داں سے محروم رہنا گناہ سمجھا۔ جہاں تک ہماری مسلمانی کا تعلق تھا، اس میں ایک نئی تازگی

اور تابندگی محسوس ہونے لگی۔ اور وہ جو مشتاق احمد یوسفی نے کہا ہے کہ دو چار دن مونگ

کی داں کھاؤں تو اردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشہ تجارت کی طرف مائل

ہوتی ہے، کسی اور داں کی بات ہوگی۔ ورنہ اگر ان کا روئے سخن بابورام کی داں کی طرف

ہے تو یہ بہتان ہے۔ اگر جناب یوسفی مینا کیمپ میں میرے ہم نوالہ ہوتے تو آج چراغ تلے

لکھنے کے علاوہ صاحب دیوان بھی ہوتے اور بنک کی بجائے کسی برگیڈ کی کمان کر رہے ہوتے۔

قاہرہ ایام جنگ میں

دوسری صبح ایک گرمی، میٹھی اور لمبی نیند سے بیدار ہوئے اور عین اسی لمحہ باؤرام چائے کی صبوھی لے کر خیمے میں داخل ہوا۔ بیداری اور چائے بیک وقت کیونکر ظوریں آئیں، میرے فہم سے بعید تھا۔ ان اسرار کو باؤرام جیادانائے راز ہی کھول سکتا تھا، لیکن میں یہ راز کُرید کر باؤرام کی الہامی بیراگیری کا انداز نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر تازہ وردی پہن کر کیمپ کے دفتر میں گیا۔ ایڈجوٹنٹ صاحب کو حاضری دی۔ کمان افسر صاحب سے مختصر اور خوشگوار سی ملاقات ہوئی یعنی ہمیں بتایا گیا کہ ہفتہ بھر کے لیے ہر قسم کی ڈیوٹی معاف ہے اور یہ کہ ہفتہ بھر ہم اپنے ساتھ جو سلوک چاہیں کر سکتے ہیں۔ یعنی چاہیں تو تصورِ جاناں میں دن بھر لیٹے رہیں اور چاہیں تو تلاشِ جاناں میں اہرام مصر پر چڑھ دوڑیں۔ یہ دوسری حرکت ہم نے کی تھی، لیکن کافی عرصہ بعدیں۔ سردست ہمارے دل میں قاہرہ بستا تھا۔ ایک دو دیسی افراد ہر جا رہے تھے، ان کے ہمراہ کاب ہو لیے۔

مینا کیمپ سے نکلتے ہی کار ایک کشادہ، بلند اور دکش سی شاہراہ پر آنکلی۔ یہ میناروڈ تھی جو اہرام اور قاہرہ کے درمیان شمالاً جنوباً واقع ہے۔ اس کی دس میل کی لمبائی میں دو نول

طرف مشمول پاشاؤں کے وِلا (VILLAS) تھے جو باغوں کے لامتناہی سلسلے میں واقع تھے۔ وِلاؤں اور پاشاؤں کے باطن کے حالات تو خدا ہی جانے — اور خدا کے لیے یہاں جاننے کو بہت کچھ تھا — لیکن ان کا بیرونی منظر بے حد جاذب تھا۔ قاہرہ کی تمہید واقعی حسب توقع تھی۔

آگے چل کر دریائے نیل کا پل عبور کیا تو گویا قاہرہ کے دروازے پر دستک دی! دھر قاہرہ نے زندگی سے بھرپور جواب دیا۔ عورتوں اور مردوں سے بھرے ہوئے بازار۔ مرد اکثر فوجی، باوردی اور غیر ملکی، لیکن ذرا کھوئے کھوئے سے۔ گویا سمجھنا مشکل نہ تھا کہ کس چیز کی تلاش میں ہیں۔ عورتیں اکثر مصری، انداز لباس اور آرائش کیسو میں بے حد مغرب زدہ مگر ایک خاصی تعداد دخترانِ مغرب کی بھی تھی جو خاکی وردیوں میں سینہ تان کر مصر کے بازاروں میں اکٹوسروس بجالارہی تھیں۔ مجموعی طور پر زنانہ اور مردانہ فوجیوں کی اس قدر کثرت تھی گویا اصل جنگ صحرائے لیبیا میں نہیں، قاہرہ کے بازاروں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور فوجی بھی ہر ملک کے۔ ہندی۔ برطانوی۔ آسٹریلوی۔ کناڈوی۔ نیوزی لینڈوی۔ یونانی۔ افریقی۔ فرانسیسی۔ پولستانی۔ الغرض ہٹلر کے تمام تر ہم بردہ مصر میں آ جمع ہوئے تھے اور ہر طرف سے ہائے گل اور ہائے دل کی صدائیں اٹھ رہی تھیں۔

قاہرہ کی دکانیں جنگ کے باوجود مجملہ سامانِ عشرت سے آراستہ تھیں۔ رستورانوں اور تفریح گاہوں میں وہ ہجومِ خلق کہ کھوے سے کھوا اچھلتا تھا۔ بلکہ بعض خواتین و حضرات نے تو گویا اپنے شانوں کا صحیح استعمال ہی یہاں آ کر سیکھا تھا۔ قاہرہ میں جنگ کی فقط دو علامات تھیں۔ ایک بڑی دکانوں کے سامنے ریت کی بوریوں کے پٹے کہ بمباری میں سپر ثابت ہوں اور دوسرے بلیک آؤٹ یعنی سر شام ہی روشنیوں کو گل کر دینا یا مدھم رکھنا کہ دشمن کے ہوائی جہازوں سے قاہرہ کا پردہ رہے۔ لیکن علامتِ جنگ بہر حال علامت ہے، جنگ نہیں،

اور ادھر بے شمار ایسے فوجی تھے جو قاہرہ میں محض بزم یک شب منا کر سچ مچ صبح محاذ جنگ کو جا رہے تھے اور اس ایک رات کی مختصر سی فرصت میں زندگی کی تمام تر آسودگیاں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ اور انہی کی خاطر قاہرہ نے قارون کی طرح گویا راستے میں خزانہ لٹا رکھا تھا۔ جدھر دیکھو، وہ رُخوں اور زہرہ و شوں کے پرے، جو نہ صرف تعداد بلکہ شوق میں بھی مسافر فوجیوں سے ایک قدم آگے۔ اول تو سربراہ ہی نظریں لٹ جاتیں، ورنہ کسی رقص گاہ کا ٹکٹ لے کر فقط داخل ہونے کی ضرورت تھی اور پھر بقول اکبر:

یاں جوانی کی اُمنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

ہمیں اپنے ملک میں یہ کیفیت ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ ذرا ان ملکوں سے پوچھیں جو جنگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ اخلاق اور عصمت جنگ کے اولین شکار ہوتے ہیں اور کسی کو بُرائی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ہمارے ساتھی کہ راہ و رسم منزل سے بے خبر نہ تھے، گراپی میں داخل ہوئے۔ گراپی شارع سلیمان پاشا کی مشہور رقص گاہ تھی۔ اندر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا گویا بُت کدے کا ڈر کھلا۔ گراپی کے کشادہ درو والاں میں سینکڑوں مرد اور عورتیں مصروفِ اختلاط تھے۔ دفعتاً بینیڈ پر ایک نئی دُھن کی ابتداء ہوئی اور مرد و التجائے رقص لے کر اپنی پسند کی خواتین کے آگے جا بھٹکے۔ ہم نے یہ التجائیں رد ہوتی بھی دیکھیں، لیکن اکثر نے شرفِ قبولیت حاصل کیا۔ بلکہ کئی خواتین تو اس بیباکی سے طالبانِ رقص کو تاڑ رہی ہوتی تھیں کہ التجا بھی ان کے لبوں تک پہنچی ہی نہیں اور اجابت از در حق بہر استقبال می آید! — یہ لازم نہ تھا کہ پسند کی خاتون سے پیشگی تعارف بھی ہو۔ مغربی رقص کے آداب نے اجنبی کو بہت کچھ حقوق دے رکھے ہیں؛ چنانچہ تعارف اکثر رقص کے دوران ہی ہوتا اور بارہا ایسا ہوا کہ رقص کرنے کو اُٹھے تو اجنبی اور کر کے بیٹھے تو رفیق بلکہ رفیقِ زندگی!

شاید یہ زنانِ مصر کا شیوہ ہے کہ دل دینے میں بہت ثباتی کرتی ہیں۔ خصوصاً
 قبائل اور یہودی۔ اگرچہ مسلمان لڑکیاں بھی ایسی سُست مزاج نہ تھیں خصوصاً جہاں معاملہ زوجوں
 کے ساتھ ہو۔ آخر اس نیک روایت کی بانی مصر کی خاتونِ اول یعنی قلوپطرہ ہی تو تھی لیکن دورِ حاضر
 کی دوشیزائیں کہیں زیادہ با وفا تھیں۔ گو اتنی ہی زیادہ بودی تھیں۔ اگر پہلی ملاقات پر ہی کسی
 نے انگوٹھی پہنادی یا فقط دکھلا ہی دی تو دُورِ شوق سے اُن کے چہرے تہمتا اُٹھتے تھے اور
 جیسے کوئی دیرینہ حسرت پوری ہو گئی ہو، چلا کر کہنے لگتیں:

”خاتم! خاتم!“

اور پھر کسی رسمی نخرے کے بغیر پیمانِ وفا باندھنا شروع کر دیتیں۔ یہ حینانِ مصر
 کی سادگی تھی یا پُرکاریِ خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن جہاں تک عشاق کی نیت کا سوال ہے
 کچھ ہم بھی جانتے ہیں۔ ان کشتگانِ محبت میں صرف ایک ادھ ہی سادہ ہوتا تھا باقی ننانو
 فی صد اچھے خاصے پُرکار عاشق تھے۔ کیونکہ بہت کم افسر ایسے تھے جو قاہرہ کا رخ کرتے
 وقت جیب میں دس بارہ انگشتیاں نہ ڈال لیتے!

لیکن گراپی کی پہلی شام کا ناقابلِ فراموش واقعہ حینانِ مصر کی دلنوازی نہ تھی بلکہ ایک
 عالمِ دین کی زیارت۔ گراپی کے بار پر کھڑے تھے اور حسبِ توفیق نرم و درشت
 مشروبات سے دل بہلا رہے تھے کہ صدر دروازے سے ایک مولانا داخل ہوئے۔ یوں
 جیسے داغ کی غزل کے کوئی شیخ جی اُٹھے ہوں۔ بے حد محتسباً نہ حلیہ، منتشرع دارِ طہی اور بادھنو
 چہرہ۔ سر پر سُرخ تر بوش اور سفید عمامہ۔ جسم مبارک پر اُجلا اور لمبا جُعبہ۔ بائیں ہاتھ میں تسبیح اور
 دایاں نال۔ شاید اس لیے کہ دُرّہ استعمال کرنا پڑ جائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حاضرین
 سے مسلمانوں کو الگ کر کے کو تو ال کے سپرد کر دیں گے کہ مے خانے میں کھڑے پائے گئے،
 لیکن جناب شیخ بار کے قریب آئے تو ذرا تھمے۔ تا آنکہ مے فروش سے آنکھیں چار ہوئیں۔

پہر ایک متبرک سی مسکراہٹ آپ کے چہرے پر پھیل گئی اور ایک مقدس آسمانی آواز میں
بارئین کو مخاطب کرتے ہوئے بولے :

”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ _____ واحد و سکی۔“

بارئین نے تعمیل ارشاد کی اور جام و سکی پیش کیا۔ جناب شیخ نے جام تھاما۔ پہلے
اس انداز سے دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پی رہے ہوں۔ پھر آنکھیں بند کر لیں جام
کو لبوں تک لائے اور پھر جس لطف جس سکون اور جس حُسن سے گھونٹ گھونٹ پینے
لگے، کہنہ مشق میگساروں کے دل موہ لیے اور مبتدیوں کو مے نوشی کا حرفِ آخر پڑھا دیا۔
اس بات کے اعتراف سے ہمیں باک نہیں کہ اس رات گراپی کی رنگینیوں نے
ہمیں مغلوب کر لیا اور جب کہیں پچھلی رات کمپ میں پہنچ کر بستر پر دراز ہوئے تو گراپی کے
ہنگامے خواب میں بھی ہمارے دماغ سے محو نہ ہو سکے۔

رہا خواب میں اُن سے شب بھر وصال
مرے بخت جاگے، میں سویا کیا

ہمیں قاہرہ میں آرام کے لیے سات دن ملے تھے۔ یہ آرام ہم نے مسلسل قاہرہ زوری
میں حاصل کیا کہ اس کے بعد ہمیں ہٹلر قاہرہ کی تفریح یا شاید زندگی کی ہی مُہلت نہ دے اور
قاہرہ میں دیکھنے کو کیا کچھ نہ تھا!

_____ وہ غیر فانی اہرام اور ابوالہول، لیکن اہرام سے زیادہ ہمیں اس
ترجمان نے متحیر کیا جو لگاتار ایک گھنٹہ فصیح انگریزی میں تاریخِ اہرام پر بولتا رہا اور خود خاک
نہ سمجھتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور ترجمان سے بھی بڑا عجوبہ وہ مصری جوان جو پانچ منٹ میں
ان فلک بوس اہرام کی چوٹیوں کو ہاتھ لگا کر سالم اُتر آتا تھا۔

_____ وہ قاہرہ کا کوہِ پیکر حصار جو کئی خونیں انقلاب دیکھنے کے بعد اب ۱۵

انڈین ہاسپٹل میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا اور جس کی بڑی کشش اس کے تاریخی مقامات نہ
 تھے بلکہ ہسپتال کی بدتمیز اینگلو انڈین نرسیں جو صحت مندوں پر مہربان اور مریضوں پر نامہربان
 تھیں۔ اور وہ خاص نرس جسے اس خاکسار نے زخمی گورکھا سپاہیوں کو ڈیم فول کہتے سنا، تو
 بلا اختیار برف کر کے ہسپتال سے باہر کیا اور بعد میں خود برف ہونے سے بال بال بچا۔

_____ وہ قلعہ کی بلندی پر چمکتا ہوا میرا یعنی مسجد محمد علی۔ وہ رنگ و سنگ کا
 معجزہ فن جس میں نمازی کم اور سیاح زیادہ آتے تھے۔

_____ وہ مشکی بازار۔ وہ تنگ و تاریک سی لکیر جس کی پُراسرار دکانوں کے
 سامنے جو بندگان عجائبات چوٹیوں کی طرح رینگتے پھرتے تھے۔

_____ وہ موم کا عجائب خانہ جس میں داخل ہوتے ہی مرحوم سعد زاعول پاشا
 بقید حیات کھڑے نظر آتے تھے۔

_____ وہ شہر ڈور کا نٹی نیشنل ہوٹلوں کی ٹیریس جہاں بلیک آؤٹ کے
 سائے میں گناہوں کے ابتدائی سودے ہوتے تھے اور پھر قاہرہ کی ٹیکسیوں میں سارے
 شہر کو لپیٹ میں لے لیتے تھے۔

_____ وہ جزیرہ ریس کلب کی گھوڑ دوڑیں جہاں پہلے روز ہی ایک گورے
 کیپٹن اور ایک گورے میجر کی ٹپ پر پورے چالیس دینار جیت لیے اور بعد میں جب ان
 افسروں سے تفصیلی تعارف ہوا تو ایک پرنس علی خان نکلے اور دوسرے ڈگلس فیر بنکس جو نیر
 اور جن کے ساتھ چند لمحوں کی ہم نشینی کا حسینان قاہرہ پر یہ اثر ہوا کہ ہمیں بھی اپنے دائرہ نواز شاہ
 میں شامل کر لیا۔ شاید اس مقولے کے تحت کہ گندم اگر ہم نرسد محس غنیمت است۔ اور خدا گواہ
 ہے کہ ہم بزرے محس بھی نہ تھے۔ سیکنڈ لفٹنٹ ہونے کے علاوہ چند اور ٹھوس خوبیوں کے
 مالک بھی تھے۔

_____ وہ نیل کے کنارے پچن رستوران جس کی نشستیں گلاب کی جھاڑیوں کی ادٹ میں سمی تھیں اور سیر شام ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے عافیت جو جوڑوں سے پُر ہو جاتی تھیں اور اسی پچن کی وہ شام جب ہمارے دوست درما اور ہم پر نزول الطاف ہوا۔ لاریب اس شام نے ہمیں ایک لازوال دولت سے مالا مال کر دیا، مگر خدا را ہم سے اس دولت کی تفصیل پُوچھنے پر اصرار نہ کیجیے گا کہ اس دن کے بعد اس شام کا جب بھی کسی نے ذکر چھیڑا، اک تیرا ایسا سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔

_____ اور وہ میناروڈ کی نائٹ کلب آبرٹز کہ جس کی کشش وہ مخصوص نیکی رقص نہ تھا، بلکہ اس رقص و سرود کا سر پرست اعلیٰ یعنی شاہ فاروق جو کلب کے شاہ نشین سے اپنے مقربین کے ساتھ داد رقص دے دیتے اور ہم جیسے ہزاروں پست نشینوں کو شرف زیارت اور درس عبرت بخشتے کہ شاہ ملک و دین کا اندازِ داد بجائے خود ایک تماشا تھا یعنی ہر رقص کے بعد آپ رفاصہ کو بلا کر اپنے پہلو میں بٹھاتے اور دستِ خاص سے اس غارت گز دین و ایمان کو جامِ مے پیش کرتے۔ پھر التفاتِ شاہی مسکراہٹوں، گدگدیوں، قبضوں، بغلیگیوں اور کبھی کبھی ہلکے بوسوں میں جلوہ گر ہوتا۔ یہ الف لیلہ کی بادشاہی معلوم ہوتی تھی اور تھی۔

_____ وہ جامعہ ازہر کہ جس کے سقف و دالان ہزار شوق سے دیکھنے گئے اور نوٹے تو اس کی تاریخی عظمت سے مرعوب تھے لیکن موجودہ دقیانوسیت سے مایوس۔ جامعہ کے طلباء سے تبادلہ خیالات ہوا، تو حضرت علامہ کامبرع یاد آیا۔

اے مسلمان اپنے دل سے پُوچھ، تُو سے نہ پُوچھ

_____ وہ قاہرہ کی شکستہ و ریختہ ٹریم کہ جس کی سیٹی اور کنڈکٹر کی یلے آج

تک کانوں میں گونجتی ہے۔ اور وہ تین الفاظ جو قاہرہ میں ہر قدم پر راستہ کاٹتے تھے:

AUBERGE DES PYRAMIDES ○

فلوس — بخشش — مافیش

— وہ مکی کے بھٹے بیچنے والوں کی صدا: ”رفیق چھلی“ جو وہ لوگ ہمارے

پنجابی سپاہیوں کی کشش کے لیے لگاتے اور ہمارے سپاہیوں کی اخوتِ اسلامی کا وہ منظر
کہ اپنے مصری دکانداروں کی ہزاروں ”چھلیاں“ سر بازار بھون کر اپنا پیٹ ادرن کی جیبیں
بھر دیتے۔ ہمارے سپاہیوں کی اس فالتوا اخوت کا ایک مظاہرہ کبھی نہ بھولے گا۔

جیسا کہ ایک جگہ پہلے کہا جا چکا ہے، ”مندوستانی مسلمان (یا اب کتنا چاہیے پاکستانی

مسلمان) بہت سادہ ہے۔ عرب ملکوں اور وہاں کے لوگوں سے اسے والہانہ عشق ہے
اور ہر عرب کے متعلق ہی سمجھتا ہے کہ بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر۔ اُسے یہ خوش فہمی بھی ہے
کہ عرب بھی ہمیں چچا زاد ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اکثر عربوں کو ان رشتہ داروں کے وجود کا ہی علم نہیں

اُن دنوں قاہرہ میں میلاد النبیؐ کا تہوار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ خود شاہِ فاروق

تقریبات میں حصہ لیتے۔ اُس سال کے یومِ میلاد میں ہمارے کیمپ کے مسلمان جوانوں نے

بھی شرکت کرنا چاہی۔ چونکہ ہمارے سپاہیوں کا مصریوں کے ساتھ اختلاط کا معاملہ تھا، کرنل

صاحب نے مجھے خود ساتھ جانے کو کہا کہ کوئی نا خوشگوار واقعہ نہ ہونے پائے؛ چنانچہ میں صوبیدار

صاحب اور کوئی پچاس جوان صاف ستھری وردیاں پہنے فوجی لاریوں میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں

پہنچے۔ شاہِ فاروق کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا کہ صوبیدار صاحب نے میرے کان میں کہا:

”اگر اجازت دیں تو شاہِ فاروق کے آنے پر ہم لغزہ بگیر بلند کریں؟“

میں نے کہا: ”آپ کو کیا تکلیف ہو رہی ہے جو آپ ایسی حرکت کرنا چاہتے ہیں؟“

بولے: ”خلیفہٴ اسلام ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ اپنے مسلمان بادشاہ کے لیے

لغزہ لگائیں۔“

میں نے کہا: ”ہم وردی میں آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں اس تقریب میں متانت سے

حصہ لینا چاہیے۔ یہ موقع نعرہ بازی کا نہیں۔ وطن میں جا کر یا یونٹ میں ہی کوئی جلسہ کر کے نعرے لگا کر دل ہلکا کر لیں گے۔“

صوبیدار صاحب خاموش ہو گئے، لیکن سخت ناخوش۔ میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے غیر اسلامی رویے پر سخت برہم ہیں۔ اتنے میں آواز آئی کہ جلالتہ الملک کی سواری آرہی ہے۔ یہ سنا تو صوبیدار صاحب کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ اُن کی نظریں اُس سمت میں گڑ گئیں جدھر سے شاہ فاروق کو جلسہ گاہ میں داخل ہونا تھا۔ اُن کا تنفس تیز ہو گیا۔ میں نے اُن کی حالت غیر ہوتے دیکھی تو اُن کے بازو پر ہاتھ رکھا، لیکن ہاتھ کی بجائے اُن پر شہتیر بھی آگرتا تو اُن کی توجہ کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ وہ اب ایک دوسری دُنیا میں پہنچ چکے تھے جو نہی شاہ فاروق نے دروازے کے اندر قدم رکھا، صوبیدار صاحب بجلی کی سرعت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فضا میں ایک آواز بلند ہوئی:

”نعرہ — اے — تکبیر“

نعرہ اور لمبی اے کے بعد تکبیر کا لفظ اس طرح ادا ہوا جیسے فیتہ جلنے کی ششوں ششوں کے بعد کلینت گولہ پھٹتا ہے اور جو نہی صوبیدار صاحب لفظ تکبیر تک پہنچے، ہمارے پچاس جوانوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا:

”اللہ اکبر“

اس پر شاہ فاروق کسی قدر حیرت سے ٹکرائے اور حاضرین نے شاہی مسکراہٹ سے اشارہ پا کر تالیاں بجا دیں۔

واقعہ یہ تھا کہ ہمارے نعرے کو کسی نے سمجھا نہ تھا۔ چاروں الفاظ بیک وقت عربی کے تھے، لیکن اُن کا نہایت عظیم اور وہ بھی ایک نعرے کی شکل میں مصریوں کے فہم سے بعید تھا۔ وہ یہ سب سے کہ ہندوستانی فوجیوں نے کوئی تاثر کیا ہے؛ چنانچہ میں نے صوبیدار صاحب کو ایک

قرآلوذنگاہ سے دیکھا، لیکن صوبیدار صاحب تو اپنے خلیفہ کے حضور میں تھے۔ ایک خستہ نیم لٹین کیا اور اُس کی نگاہ غضب کیا؛ شاہ فاروق ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ جب ہمارے قریب سے گزرے تو جیسے صوبیدار صاحب کا اندر سے بٹن دب گیا ہو۔ پھر دیوانہ وار اٹھے اور دایاں بازو بلند کر کے نعرہ تکبیر کی صدا لگائی اور ایک مرتبہ اور اللہ اکبر کی آواز گونجی۔ اب کے شاہ فاروق نے قہقہہ لگایا اور تمام حاضرین خصوصاً پاشاؤں نے شاہی قہقہے کی تائید میں اپنے جی حضوری گلے پھاڑ کر رکھ دیے اور شامیانہ سر پر اٹھالیا۔ — ہر چند کہ اللہ اکبر کا نعرہ ہمارا دین و ایمان تھا؛ تاہم اس مجلس میں اس نعرہ بازی سے ہم تماشہ بن گئے۔ شاہ فاروق کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی، تو جلسے کے منتظم بکری پاشا میرے پاس آئے اور ٹٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے مبارکباد دے کر کہنے لگے:

”تمہارے جوانوں کے تماشے سے جلالتہ الملک بہت خوش ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ

حضور کی رخصت کے وقت بھی ایسا ہی کریں، تو حضور اور خوش ہوں گے۔“

لگے ہاتھوں مجھے یہ مژدہ بھی سنایا کہ تمہاری چائے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اب اگر میں بکری پاشا کو دل کی بات بتاتا تو کتنا کہ تم اور تمہارا بادشاہ بہشت کی دوسری طرف جاسکتے ہو، لیکن یہ کہنے کی بات نہ تھی۔ بکری پاشا کی سنا کیا اور خون جگر پتیارہا۔ صوبیدار صاحب بھی بکری پاشا کی سن رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ خلیفہ وقت کی خوشنودی کا امکان ہو، تو وہ دن بھر نعرے لگاتے رہیں گے۔ بہر حال جیسا کہ فوج کا دستور ہے میں نے صوبیدار

صاحب سے کہا:

”آپ نے عدول حکمی کی ہے۔ آپ اپنے کو زیرِ حراست سمجھیں۔“

صوبیدار صاحب کے چہرے کا رنگ ذرا پھیکا ہونے لگا اور آپ نے میری طرف

دیکھا بلکہ پہلی دفعہ محسوس کیا کہ یہ شخص بھی ساتھ آیا ہے اور غالباً اپنے دل میں وہی باتیں سوچنے

لگے جو گرفتاری کے وقت لوگوں کے دماغ میں آتی ہیں؛ چنانچہ ایک لمحے کے لیے ان کے ذہن میں خلیفۃ اللہ اور بکری پاشا کے درمیان سے ہمیں بھی باریابی ہوئی لیکن اتنے میں فاروق تقریر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے لمحے صوبیدار صاحب نے ہمیں دماغ سے نکال باہر کیا۔ ان کی آنکھوں میں پھر وہی روشنی عود کر آئی۔ ان کے نزدیک ہر مصری باتیں کرتے وقت قرآن پڑھتا معلوم ہوتا تھا اور اب تو امیر المؤمنین خود سخن سنج تھے۔ صوبیدار صاحب کی آنکھوں کی روشنی ایک آتشیں شعلے میں تبدیل ہو گئی۔

فاروق ابھی دو لفظ بھی نہ کہنے پائے تھے کہ صوبیدار صاحب نے اپنی جگہ پر ہی یعنی میری بغل سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ فاروق اس دخل در معقولات سے پہلے تو ذرا اٹھٹھک سے گئے لیکن معان کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا اور تمام پاشے کھلکھلا اٹھے۔ تالیاں بجا شروع ہوئیں۔ صوبیدار صاحب نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ مصر فتح کر لیا ہے۔ لگے ہاتھوں ایک مزید نعرہ لگایا مگر دفور جوش سے گلے پر معمول سے زیادہ زور دے دیا۔ آواز بچکولے کھانے لگی۔ فاروق اور ان کے حواری ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ بکری پاشا بھاگے بھاگے آئے اور میرا شکریہ ادا کیا کہ تمہارے سپاہیوں نے جلالتہ الملک کو آمادہ خندہ کر دیا۔ میں شرم سے غرقِ نیل ہو رہا تھا نہ صرف ہماری فوج بلکہ قوم کی بسکی ہو رہی تھی اور یہاں دونوں کی آبرو کا محافظ میں تھا کہ سب سے سینئر تھا لیکن اپنی سیناریٹی کا استعمال کس شکل میں کرتا؟

بکری پاشا کی وارسی نوچ لیتا؟

فاروق کو شٹ اپ کہتا؟

صوبیدار صاحب کے منہ میں فونٹین پن ڈال دیتا؟

یا کمپنی کو وہیں فالن کر کے رائٹ لیفٹ کرتا جلسہ گاہ سے باہر نکل آتا؟

ان میں سے کوئی حرکت بھی کرتا تو صوبیدار صاحب سے بھی زیادہ تمنازاؤ بنتا؛ چنانچہ

انتہائی بے بسی میں سر جھکا کر بیٹھا کیا اور سنتا رہا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے سر پر کیا کیوں
آرے چلے اور کیا کیا نعرے لگے۔

آخر مجلس برخواست ہوئی۔ واپس کیمپ میں پہنچے۔ صوبیدار صاحب کہ اب ڈبرار خلیفہ
سے نکل کر پرنٹ لائن میں آگئے تھے، برخواستگی بلکہ قید کی تیاری کرنے لگے۔ صوبیدار صاحب
کا مجرم واقعی سنگین تھا، لیکن اس سادہ اور جو شیعے مسلمان کا جیل خانے سے ایک بہتر اور باعث
مصرف بھی تھا، یعنی محاذ جنگ۔ دوسرے روز دفتر میں بلایا تو صوبیدار صاحب سمجھے کہ اب
کورٹ مارشل ہوتا ہے لیکن جب محاذ جنگ پر جانے کا حکم سنا تو ان کی آنکھوں میں روشنی
کی وہی پُرانی کرن بھڑوٹی۔ سیلوٹ کیا، دفتر سے باہر نکلے اور معاً اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی، نکلا ہوتا
کہ یہ نعرہ امیر المومنین کی شان میں نہیں بلکہ "غریب الافریہ" جیسی اس خاکسار سیکنڈ لٹننٹ
کے اعزاز میں ہے۔

چند روز عباسیہ کمیپ (قاہرہ) میں

میں کمیپ میں ہمیں صرف سات دن کے لیے ٹھہرایا گیا تھا، لیکن مہینہ پورا گزر گیا اور کسی نے ہم سے اتنا سا آسان سوال نہ کیا کہ منہ میں کسے دانت ہیں۔ اور ہمیں خود کیا ضرورت تھی کہ منہ کھولتے؟ ہمیں مولانا حالی کا فارمولایا دیا تھا کہ عقلمند زبانیں بتیس دانتوں میں کیسے رہا کرتی ہیں، یعنی کروٹ نہیں بدلتیں۔ ہم نے بھی زبان نہ ہلائی، کیونکہ ہمیں ہٹلر کی ملاقات کی اتنی بے تابی نہ تھی؛ چنانچہ اس خدا داد فرصت کو عنایت جانا اور قاہرہ کا گھونگھٹ اٹھا کر ذرا تفصیل سے دیکھنا شروع کیا تا آنکہ خداوندان کمیپ کو احساس ہوا کہ یہ شخص کسی قدر زائد المیعا دہو چلا ہے؛ چنانچہ ہمیں فی الفور کمیپ سے روانگی کا حکم ملا، لیکن حکم پڑھا تو ہمارا تبادلوں محاذ کی بجائے عباسیہ کمیپ میں کر دیا گیا تھا جو قاہرہ کے دوسرے یعنی شمالی سرے پر واقع تھا۔

محاذ کی بجائے عباسیہ جانا ہمیں یوں معلوم ہوا جیسے عمر طبعی کے علاوہ کچھ فال تو زندگی عنایت ہو گئی ہے اور ہم نے طے کر لیا کہ ان جھونگے کے ایام میں ہم قاہرہ کو حسب ضرورت تہ وبالا کریں گے، لیکن یہ خدا تعالیٰ اور لفٹنٹ کرنل پیٹرسن کو منظور نہ تھا۔

لفٹنٹ کرنل پیٹرسن عباسیہ کمیپ کے کمان افسر تھے۔ آپ کی سیرت کے کئی درختاں پہلو تھے لیکن جس پہلو سے ہم ماتحتوں کا واسطہ تھا، یعنی آپ کا مزاج، وہ اتنا درختاں نہ تھا جتنا

آتشِ قتال تھا۔ نتیجتاً ہمیں جرموں کے علاوہ اپنے کرنل صاحب سے بھی جنگ یا خانہ جنگی کا سامنا تھا۔ آپ ادھیڑ عمر اور درمیانے قد کے غُبرو سے آدمی تھے۔ ملاقات پر ابتدائی کلمات میں ایسی شرافت و حلاوت کا اظہار کرتے کہ آپ پر فرشتہ ہونے کا گمان ہونے لگا، لیکن جوں جوں گفتگو بڑھتی آپ صراطِ مستقیم سے بتدریج پھسلنے لگتے اور اپنی حلاوت میں عرقِ چرائتہ ملاتا شروع کر دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی شبہ نہ رہتا کہ آپ کون سے فرشتے کے بروز ہیں۔ ہم نے کئی لوگوں کو آپ کے دفتر میں گنگناتے اور چھپاتے داخل ہوتے دیکھا۔ پتی کے پیچھے سے ایک دو تھتھے بھی سُنائی دیے لیکن پھر کبھی جنین بلند ہوئیں، کبھی گالیاں گونجیں، کبھی مکے چلے اور کبھی تھپتھیر سے۔ چونکہ کرنل صاحب مساوات کے قائل تھے؛ لہذا اس کلمے سے کوئی ملاقاتی مُستثنیٰ نہ تھا۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایک دن کیمپ کے ایڈیٹورنٹ کیپٹن بنگو فنگ شریف ملاقات حاصل کرنے کے بعد نکلے تو اُن کی آنکھ کے گرد ایک بے عیب آبنوسی ہالہ تھا جو کرنل صاحب کے زورِ دست کا نتیجہ تھا۔ دوسرے دن سینڈ ان کمانڈ میجر بریٹ برآمد ہوئے تو اُن کے کپڑوں پر روشنائی کی ایک وسیع اور دلکش سی افشال تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ ایک دوات کا خونِ ناسخ بھی کرنل صاحب کے سر ہے۔ غریب ہیڈ کلرک کے ماتھے پر تو ایک مُستقل مخروطی "روڑا" ابھرا رہتا تھا جس کی تازگی میں کوئی کمی نہ آتی تھی کہ کرنل صاحب مناسب وقفوں کے بعد اپنے پیپر ویٹ سے اس کی تجدید کرتے رہتے تھے لیکن کرنل صاحب کا شاہکار وہ واقعہ تھا جو ایک صبح انہیں کیمپ کے مالی کے ساتھ پیش آیا۔

سات بج رہے تھے۔ تمام لوگ اپنے کاموں پر آرہے تھے۔ کرنل صاحب بھی ہاتھ میں چھڑی لیے دفتر کی سمت رواں تھے کہ اتفاقاً آپ کی نگاہ مالی پر پڑی جو پھولوں کی کیاری میں

کام کر رہا تھا۔ جب معمول آپ نے اُسے بھی بے مقصد شرف گفتگو بخشا۔ پھر جیسا کہ دستور تھا، گفتگو شاہتوں سے گزر کر گالیوں سے ہوتی ہوئی ڈنڈوں تک آپہنچی اور مالی بھاگ نکلا۔ خدا جانے کرنل صاحب کو کیا سوجھی کہ مالی کا تعاقب شروع کر دیا اور ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ آگے آگے مالی عربی زبان میں فریاد کرتا ہوا بھاگ رہا ہے اور پیچھے پیچھے کرنل صاحب انگریزی میں گالیاں دیتے ہوئے تیزی سے لپک رہے ہیں۔ کیمپ کے سیکڑوں افسر اور سپاہی کام چھوڑ کر تماشہ کرنے لگتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کوئی بدتمیز جو نیر افسر جھوٹی تحسین کے طور پر کرنل صاحب کے حق میں تالی بھی بجا دیتا ہے۔ ادھر بھاگتے مالی کے چہرے پر ہراس ہے اور پیشانی پر پسینہ۔ کرنل صاحب کی آنکھوں میں غضب ہے اور منہ پر بھاگ۔ راہ میں ایک ٹینک کھڑا ہے۔ مالی جان عزیز بچانے کی خاطر ٹینک پر چڑھ جاتا ہے، لیکن پیچھے دیکھتا ہے تو کرنل صاحب بھی جوں توں کر کے ٹینک پر چڑھ رہے ہیں۔ مالی بے خطر چھلانگ لگا کر زمین پر آ جاتا ہے۔ کرنل صاحب بھی اتنی ہی بے ساختہ چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ مالی کہ جوان ہے، سنبھل کر اٹھتا ہے اور بھاگنے لگتا ہے لیکن کرنل صاحب کا یہ حال ہے کہ عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام چھلانگ کے بعد ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ مالی مڑ کر دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ آج کا تماشہ ختم ہے۔ آرام سے اُلٹے قدم جا کر کیاری میں نلانی شروع کر دیتا ہے۔

بد قسمتی سے اس حادثے میں کرنل صاحب کے پاؤں میں چوٹ آگئی۔ دو دن ہسپتال میں رہے۔ مہینہ بھر لنگڑاتے رہے اور مہینہ بھر ہمارا جنیا حرام کر دیا۔ یعنی اور باتوں کے علاوہ ہمارے شہر جانے پر پابندی لگا دی۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ مالی کی گرفتاری میں غیر جانب داری سے کیوں کام لیا؟

جیسا کہ کیمپ آرمڈ فورسز میں رسالے والوں کا کیمپ تھا۔ فوج میں رسالے والے اپنے بانکپن کے لیے مشہور ہیں۔ تنگ پٹونیں اور لمبے کوٹ پہنتے ہیں، لمبے بال رکھتے ہیں اور لمبی

ہاںکتے ہیں۔ دوسرے فوجیوں کو ایسی نراکتوں کی اجازت نہیں لیکن رسالے والوں کے لیے یہ سب کچھ روایتاً جائز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے دم سے ہی فوج کی سپاٹ زندگی میں کچھ آب و رنگ ہے۔ میں کہ سگنل کور کا ایک خاکا پوش تھا، ایسے ہی خوش وضع افسروں سے گھرا ہوا تھا۔ جے جی سنگھ، جوشی، حبیب اللہ، محمد یعقوب، ارجن داس سنگھ اور ہیشمار انگریز افسر۔

لفٹنٹ جے جی سنگھ نان سٹاپ باتیں کرتے تھے، لیکن باتوں میں وہ لذت کہ جو اس نے کہا۔ ہمارے دل میں نکلا۔ جوشی بھی لفٹینٹ تھے۔ چھوٹے قد کی وجہ سے رسالے میں کسی قد بے جا سے لگتے تھے، لیکن اپنی رنگین مزاجی سے وہ معترضین کی توجہ قد کی طرف آنے ہی نہ دیتے تھے۔ جوشی کی یاد اس غزل سے وابستہ رہے گی جو خورشید نے ایک نہایت ہی دلربائے میں گائی ہے اور جس کا مضمون ہم پردیسوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ پہلا مصرع تھا:

” جو ہم پہ گزرتی ہے ستاروں سے پوچھیے“

جوشی ہر شب یہ ریکارڈ لگاتے اور جب ختم ہو چکے تو اپنی پونامیں رہنے والی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ خدا جانے سالی ستاروں سے سوال بھی کرتی ہے یا نہیں؟ کس کو خبر ہے میرے سمندر کے پار کی!

کیپٹن حبیب اللہ بٹل (BUBBLE) کہلاتے تھے۔ ہم سے سینئر تھے اور ذرا دماغی فاصلے پر رہتے تھے۔ خاصے انگریز مزاج تھے، لیکن رمضان میں دن بھر کی فوجی مشقت کے باوجود روزے رکھتے تھے۔ ارجن داس سنگھ اور یعقوب ہماری طرح سیکنڈ لفٹینٹ تھے۔ ہمارے ہم نوالہ وہم پیالہ تھے اور انہی نوالوں اور پیالوں کی خاطر ہم ہر شب کرنل صاحب سے آنکھ بچا کر گراپی یا بادیہ میں جا سکتے تھے۔

لیکن ان سب میں سے دلچسپ آدمی کیپٹن رام ناتھ تھے۔ ابتدائے جنگ میں سالدار

○ وزن شعر برگردن فلمی شاعر

تھے اور اگر جنگ نہ چھڑتی تو شاید رسالدار ہی جیتے اور مرتے، لیکن جنگ کے فیض عام میں خانہ براندازانِ فوج نے آپ پر بھی کپتانی پھینک دی اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا کر کے آپ کا ستیاناس کر دیا یعنی ایک عظیم الشان رسالدار کو ایک نہایت بے توفیقے افسر میں بدل دیا۔

رام ناتھ اپنے سٹیفکیٹوں کے علاوہ شکل و صوت سے بھی نیم خواندہ لگتے تھے۔ آپ کا کپتان ہونا نہ صرف آپ کے مزاج کے منافی تھا بلکہ غالباً قضا و قدر کے ابتدائی منصوبے کے بھی خلاف تھا۔ آپ کسی کام میں بھی کپتانی کرتے تو آپ سے حوالداری ہو جاتی۔ پریڈ پر جاتے تو سپاہیوں پر دانت پینا شروع کر دیتے۔ وردی پہنتے تو سُر اور ٹوپی میں تسلی بخش ربط نہ پیدا ہو سکتا۔ چائے پیتے تو ہونٹوں سے نہیں بلکہ پھیپھڑوں کے زور سے۔ پیالی ہونٹوں کے قریب جاتی تو پھر پھڑانے لگتی اور خرا کی سی آوازیں آنے لگتیں! اغرض آپ چائے اسی اصول پر پیتے جس پر جیٹ طیارے پرواز کرتے ہیں۔ سگریٹ پیتے تو پہلے اُسے مٹھی میں بھینچتے اور پھر آنکھیں بند کر کے کش لگاتے اور آنکھیں کھولنے تک اُسے راکھ کر دیتے۔ یہ دیکھ کر میں داغ کا مصرع گنگناتا

”جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں“

اس پر آپ فرماتے: ”مُلوم ہندا اے، ایہہ داگ وی بر گٹ پیندا اسی۔“

آپ نے کہیں سے سُن لیا تھا کہ افسری شراب پینے بغیر نچتہ نہیں ہوتی؛ چنانچہ سر شام اپنے کوارٹر کے باہر میز پر بوتل اور گلاس رکھ کر بیٹھ جاتے اور پینے سے پہلے ہی ایسی باتیں شروع کر دیتے جن سے اُن کے خیال میں مستی کا اظہار ہوتا تھا مثلاً ہو یا ہٹلر کو مخاطب کر کے بڑی ندرق برق مگر عام فہم گالیاں بکتے۔ اب پنجابی گالیاں بیشک تو انا اور دُور رس تخیل کی آئینہ دار ہوتی ہیں؛ تاہم اُن سے مستی سے زیادہ زبردستی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ مے نوشی سے بھی رام ناتھ کی رام ناتھی ہی نکھری اُن کی کپتانی کا ملمع اُن کا جزد بدن نہ ہو سکا۔

یہ نہیں کہ ہر وہ آدمی جو رینک سے ترقی پا کر افسر بنا، رام ناتھ تھا۔ جی نہیں بے شمار افسر

ایسے تھے جو سپاہی بھرتی ہوئے اور بعد میں افسری خود ان کے استقبال کو آئی۔ وہ اس بات کو نہیں چھپاتے تھے کہ انہوں نے بطور سپاہی ابتدا کی۔ بلکہ کبھی ذکر کرتے تو ان کے سپاہی رہنے پر رشک آتا، لیکن عام طور پر یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے جوانی میں ہی افسری کی منزل عبور کر لی تھی۔ رام ناتھ بہت بوڑھے طوطے تھے اور اس عمر میں میاں مٹھو سے زیادہ پیچیدہ بات کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

کرنل پیٹرسن کی تنگ مزاجی کی وجہ سے عباسیہ کیمپ کی زندگی کافی پھینکی تھی۔ اچانک جرمنوں کو ہم پر رحم آیا اور انہوں نے ہمارے لیے رونق کا سامان پیدا کر دیا یعنی ایک رات عباسیہ کے نواح میں ہوائی جہازوں سے فی البدیہہ دس بارہ بم پھینک دیے۔ اس خیال سے کہ شاید جرمن اپنی چھاتہ فوج قاہرہ کے ہوائی اڈے الماذا پر اتارنا چاہتے ہیں، ہمیں راتوں رات الماذا کی حفاظت کے لیے باہر جانے کا حکم ملا۔ حکم دینے والوں کے حق میں کلمہ خیر سے مختلف کلمہ پڑھتے ہوئے بستر سے اٹھے۔ وردی بہنی اور سارا کیمپ بیٹل آرڈر میں الماذا کی طرف بڑھا اور ایرو ڈروم کے گرد خندقیں کھود کر مورچہ گیر ہو گیا۔

رات گزر گئی، لیکن جرمن ہوائی جہاز نہ لوٹے۔ بہر حال ہمیں بتایا گیا کہ جرمنوں کا انتظار جاری رہے گا۔ رات تو کسی نہ کسی طرح تارے گن کر گزار دی، لیکن دن بھر کا انتظار بڑا گراں گزارا۔ جرمنوں کو آنا تھا نہ آئے، لیکن انتظار ہفتہ بھر جاری رہا۔ وہ عربی کہاوت ہے کہ انتظار موت سے بھی اشد ہوتا ہے۔ موت کا تو ہمیں بالفضل تجربہ نہ تھا، لیکن مزید انتظار سے بچنے کے لیے ہم اس تجربہ پر بھی تیار تھے؛ چنانچہ اسی ہفتے کسی وقت اگر جرمن آجاتے تو ہم بے حد ممنون ہو کر ان سے لڑتے اور مرتے۔

آخر سات دن کے بعد کسی کو رحم آیا اور ہمیں حکم ملا کہ رات اپنے کوارٹروں میں سو سکتے ہو، لیکن صرف آدھ گھنٹے کے نوٹس پر۔ گویا وردی پہن کر ہی بستر پر دراز ہونا تھا۔ ہمیں اتنی رعایت

بھی غنیمت تھی۔ ہمارے اکثر ساتھی سچ سچ وردی میں ہی سوئے، لیکن ہم نے ریشمی پاجامہ زیب
 تن کیا۔ نماز پڑھی اور ایک میٹھی نیند کی ابتداء کی۔ لیکن کرنا خدا کا بلکہ جرموں کا کیا ہوا کہ اسی رات
 الماذا پر پھر ہوائی حملہ ہوا۔ فی الفور الارم ہوا اور آدھ گھنٹے میں ہم پھر مورچوں میں تھے۔ یہ مورچوں میں
 بیٹھنا بھی قابل برداشت تھا لیکن الارم سن کر بیدار ہونا، بستر سے جدا ہونا، ریشمی پاجامے کی جگہ خاکی
 وردی اور اوپر چمڑا مع پٹھو پہننا، کمر میں سپتول لگانا اور سر پر آہنی خود رکھنا۔ سراسر ظلم تھا جو ہوتا تھی۔
 ادھر اہل مصر یہ سمجھے کہ انگریزوں کے دن گنتی کے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھ کر استعمال یا روٹ
 کا نعرہ لگانے لگے۔ انگریزوں نے قاہرہ کے بازاروں میں جانبارو ڈبلاک لگا لیے کہ روٹل یا
 اُس کے متوسلین ادھر آہی نکلیں تو ان پر انگریزوں کی نارضا مندی واضح ہو جائے۔ جب اہل
 مصر کو ذرا تیزی سے آزادی کے خواب آنے لگے، تو انگریز اس لذتِ خواب میں کسی قدر
 بدتمیزی سے نخل ہوئے۔ پانچ چار ٹینک شاہ فاروق کے العابدین محل کے ارد گرد کھڑے
 کر دیے اور شاہ موصوف کو ایک طشتری میں قلم رکھ کر ایک لکیر پر دستخط کرنے کی زحمت دی
 شاہ نے نیچے ٹینک دیکھے اور اوپر جرمن طیارے غائب پائے تو دستخط کر دیے اور بیک
 جنبش قلم ایک حقیر سے کاغذ کو تاریخ میں اور ایک ناچیز سے قلم کو برٹش میوزیم میں جگہ دے
 دی۔ پھر انگریز کانڈرز سے ہاتھ ملایا۔ اُسے وکی پیش کی اور اپنے وزیر اعظم علی ماہر پاشا کو
 الوداع کہی۔ انگریزوں نے اپنی پسند کا وزیر فاروق کو پیش کیا اور اتفاق کی بات کہ فاروق کو
 نیا وزیر اعظم انگریزوں سے بھی زیادہ پسند آیا!!

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
 آخر جنرل مانگرمی العالمین پہنچے اور جرموں کی توجہ ادھر بٹ گئی۔ قاہرہ میں انگریز
 پھر سڑاٹھا کر چلنے لگے اور ہمارا کیمپ نئے سرے سے اپنے کونسل صاحب کی کمر فرمائی کے
 لیے محفوظ ہو گیا۔ اس کرم سے مقوڑا سا حصہ اس خاکسار کو بھی ملا اور وہ یوں کہ ایک جیب میں

بلیٹھا ہوائی اڈے کو جا رہا تھا کہ کیمپ کے دروازے پر کرنل صاحب مل گئے ہیں نے
حسب معمول سلیوٹ کیا تو کرنل صاحب نے بجا بل بندہ پروری نہ صرف سلام کا جواب دیا،
بلکہ جیب کو ٹھہرا کر مجھے ”ہیلو خان“ بھی کہا اور پوچھا:

”کہاں جا رہے ہو خان؟“

عرض کیا: ہوائی جہاز سے خاص ڈاک آرہی ہے۔ اُسے لینے جا رہا ہوں۔“

مگر اکر بولے: ”شاباش، جہاز کس وقت آتا ہے؟“

عرض کیا: ”دس بجے۔“

بولے: ”نہیں گیارہ بجے۔“

میں نے ادب سے کہا: ”شاید آپ کو یاد نہ ہو دس بجے ہی آتا ہے۔“

اس کے بعد وہی ہوا جو شدنی تھا۔ کرنل صاحب نے جوش میں آکر اپنی ٹوپی زمین

پر دے ماری اور جیب کو اپنی چھڑی سے ضرب لگا کر بولے:

”دس نہیں گیارہ بجے آتا ہے۔“

ظاہر تھا کہ اب شعلے بلند ہوں گے لیکن پیشتر اس کے کہ مالی والی تاریخ دہرائی جاتی

ڈرائیور نے زبان نکال کر کرنل صاحب کا منہ چڑایا، ایکسپریٹ کو دبایا اور جیب فراتے بھرتے

ہوئے نکل گئی۔ جواب میں کرنل صاحب نے ہم پر تو دانت پلے، لیکن ڈرائیور کی بدتمیزی پر

دیے اور انہیں ہنسنا ہی چاہیے تھا کیونکہ ہمارا ڈرائیور کوئی سپاہی لہنا سنگھ نہ تھا بلکہ نہایت ہی

شوخی و تنگ آئے ٹی ایس لڑکی مس مارگریٹ تھی اور کرنل صاحب ہر چند کہ سر کے کھوکھلے تھے،

سینے میں دل رکھتے تھے۔

بہ حال ہمارا تصور معاف ہونے والا نہ تھا اور نہ ہی ہم مستقل طور پر مارگریٹ کی حفاظت میں

رہ سکتے تھے؛ چنانچہ ہم آنے والے طوفان کے انتظار میں بیٹھ گئے، مگر دوسرے ہی روز ایک

ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہماری زندگی میں تو ایک انقلاب سا برپا کر دیا، لیکن کرنل صاحب نے بھی اس میں حصہ لے لیا اور بقول لاہوریاں: ”بدو بدی“

واقعہ یہ ہوا کہ قاہرہ کے مشرقی مضافات میں جنہیں ”المعادی“ کہتے ہیں رائل سگنل کور کا ایک بہت بڑا کیمپ اور سکول تھا۔ اسی سکول کے انڈین ونگ کے افسر کمانڈنگ کیپٹن اُوٹرا سنگھ تھے۔ اتفاق سے اُن کی وطن کو واپسی کا وقت قریب آ گیا اور جی ایچ کیو ہڈل سٹ (قاہرہ) کو اُن کے جانشین کی حاجت محسوس ہوئی۔ اسی تلاش میں عباسیہ کیمپ سے فون پر پوچھا گیا کہ اگر سگنل کور کا کوئی موزوں سا افسر ہو تو اس کا نام پتہ بتاؤ۔ فون لینے والے کیمپ کے ایڈجوٹنٹ کیپٹن بنگو تھے اور ہمارے یار تھے۔ جواب میں بولے:

”بڑا موزوں آدمی ہے لیکن ہے ذرا سینڈ لفٹیننٹ ہی۔ کوئی ڈیڑھ سال سروس ہے۔“

ادھر جی ایچ کیو کے فون پر کوئی حاتم طانی بیٹھا تھا۔ بولا: ”اگر موزوں ہے تو سروس کی فکر مت کرو۔ ہم کپتانی دیں گے لیکن اُس سے کہو کہ معادی جا کر سگنل سکول کے کرنل سے اپنی موزونیت کی تصدیق کرا لائے۔ اگر کرنل صاحب نے ہاں کر دی تو ہم کل اُس کے تقرر کا حکم بھیج دیں گے۔“

بنگو نے یہ سنا تو بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور چٹھی دے کر ہمیں معاویہ کیمپ کے کمانڈر کرنل جوڑڈین کے پاس بھیج دیا۔ بنگو اور ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ معاملہ کرنل پیٹرن سے پوشیدہ رکھا جائے گا۔ ورنہ ہماری کپتانی کے بن کھلے ہی مڑ جا جانے کا اندیشہ تھا۔

معاویہ میں کرنل جوڑڈین سے ملاقات ہوئی تو بڑے شفیق سے بزرگ نکلے۔ اس بات سے خاص طور پر متاثر ہوئے کہ سگنل کور کا ایک افسر رسالے کے کیمپ میں ضائع ہو رہا ہے۔ بولے:

”حکم ملتے ہی یہاں آ جاؤ۔“

○ اصل نام ذرا مختلف تھا۔

ظاہر تھا کہ کرنل صاحب کی نگاہ میں ہم موزوں ہیں؛ چنانچہ دوسرے روز ہی سچ مچ
 ہمارے نئے تقرر اور کپتانی کا حکم آ گیا۔ بنگو نے کرنل پیٹر سن سے بالابالا ہمیں موومنٹ آرڈر
 دے دیا۔ مارگریٹ بھی ہماری سازش میں شریک ہو گئی۔ چھکے سے جیب لے آئی۔ ہمیں اور
 ہمارے اسباب کو لا کر معادی پہنچا دیا۔ مارگریٹ کو الوداع کہی تو کسی قدر رنج سا ہوا، لیکن دوسرے
 روز جب معادی کی کھلی فضا میں سانس لیا تو ہماری دنیا لاکھوں مارگریٹوں کے تہم سے معمور ہو گئی۔
 جب کندھوں پر کپتانی لگائی اور کیپٹن اور اسنگھ سے انڈین ونگ کی کمان سنبھالی تو
 ہمیں معاہدہ منگمری کا خیال آیا کہ انہیں بھی پچھلے دنوں ہی آٹھویں فوج کی کمان دے کر عالمین
 بھیجا گیا تھا۔ یعنی ذمہ داریاں کچھ ایک جیسی ہی تھیں۔ ذرا سادہ جے کا فرق تھا۔ بڑی پھرتی سے
 اپنے دوستوں کو وطن میں خط لکھے جن کا مدعا فقط یہ تھا کہ اب ہم محض نیم لفظین نہیں بلکہ ہمارے
 کندھوں پر تین تین پھول کھل اٹھے ہیں۔ بارہا تنہائی میں اپنے شانوں کو دیکھا۔ ساروں کی کثرت
 سے کمکشاں نظر آتے تھے۔ حتیٰ کہ آنکھوں میں چکا چوند سی آنے لگی اور گردن میں بل پڑنے لگے۔
 اب تو باقاعدہ اپنا یونٹ تھا اور ہم آفیسر کمانڈنگ۔ گویا سب کے محتاج نہ تھے،
 خود کو تو ال تھے، سو ڈر کس کا؟ بلکہ تھوڑی سی بے قاعدگی کر کے بھی دیکھی۔ کچھ بھی نہ ہوا یہاں کسی
 پیٹر سن کا خوف نہ تھا۔ جدھر جاتے سینکڑوں بازو سیوٹ میں اٹھ جاتے۔ محسوس ہوتا کہ دیکھنے
 والے رشک کر رہے ہیں؛ چنانچہ ہم دل ہی دل میں ہر سیوٹ کرنے والے کو دعا بھی دیتے کہ
 نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو۔ پھر آرڈر لی روم ہوتا یعنی ماتحتوں کی شکایات اور
 فریادیں سننے کے لیے دربار لگتا۔ پھر سرکاری ڈاک دیکھتے اور جی چاہتا تو کوئی خط پڑھ بھی لیتے۔
 پھر ٹیلیفون پر لوگوں سے ضروری اور غیر ضروری باتیں بلا جلا کرتے۔ ہمیں یقین تھا کہ افسری
 میں کچھ مزا ہے تو ہم لوٹ رہے ہیں۔ یہ لوٹ کوئی ہفتہ بھر جاری رہی تا آنکہ اچانک سبگو کا
 عباسیہ سے فون آیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا:

”غضب ہو گیا۔ کرنل پیٹرسن کو تمہارے جانے کا پتہ چل گیا ہے، سحت برہم ہے۔ جو اندر جاتا ہے اُسے پیپر ویٹ کھینچ مارتا ہے۔ تمہارے متعلق جی ایچ کیو کو لکھ رہا ہے کہ کپتانی کے قابل نہیں۔ اسے مزید تجربہ حاصل کرنے کے لیے فی الفور محاذ جنگ پر بھیجا جائے۔ اب تم جلد ہی جی ایچ کیو سے سُن لو گے۔ ساری اولڈ بوائے۔“

یعنی ہماری حالت کچھ فیض سے ملتی جلتی تھی:

جو کوٹے یا رے نکلے تو سوئے دار چلے

ایک لمحے کے لیے ہمارے کندھوں کی کمکشاں مع کپتانی کے ماند پڑ گئی اور ہمارے تصور میں سیدی رزیغ، جرمن گولے اور بلی بیف آنمو دار ہوئے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

قریب تھا کہ ہم لڑکھڑا جائیں لیکن ایک بزرگ کا قول یاد آیا کہ اگر مصیبت آجائے تو اس شخص کا خیال کرو جو تم سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہو۔ اس ضمن میں موزوں ترین شخص نظام ستھ ہی تھا جس نے فقط آٹھ پہر کی سریر آرائی کے بعد آرام سے مشک اٹھا کر چھڑکاؤ شروع کر دیا تھا اور ہم تو خیر سے متواتر آٹھ دن سے کپتان تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا اور ذرا کانپتی کانپتی کپتانی بھی بدستور جاری رکھی لیکن حسب توقع دوسرے دن کرنل جوڑڈین کا اردلی سلام لے کر آیا۔ اُن کے دفتر میں گیا تو کرنل صاحب نے ایک کاغذ ہماری طرف بڑھایا۔ یہ جی ایچ کیو کا خط تھا۔ پڑھا تو وہی کچھ لکھا تھا جو بنگو نے بتایا تھا۔ رکتے رکتے پوچھا:

”مجھے کب محاذ پر جانا ہے؟“

کرنل جوڑڈین میرے سوال پر مسکرائے اور ایک دوسرا کاغذ میری طرف سرکایا۔ یہ جی ایچ کیو کو اُن کی طرف سے جواب جا رہا تھا۔ لکھا تھا:

”یہ افسر میرے ماتحت کام کرتا ہے۔ کپتانی کے لیے موزوں ہے یا نہیں اس کا فیصلہ

مجھ پر ہے اور وہ یہ ہے کہ موزوں ہے۔ عباسیہ کمیپ کے کرنل صاحب کو میری طرف سے
بعد از آداب بتایا جائے کہ دوسرے یونٹ کے افسروں پر رائے زنی کرنا فوج کا دستور نہیں۔“
ہمارے دماغ سے تیدی رزیغ، جرمن گولے اور ٹی بیف یک قلم غائب ہو گئے اور
واپس انڈین ونگ میں جا کر ہم نہایت شان و شدت سے کپتانی کرنے لگے جو نظام سقے
کی سرپر آرائی سے کہیں زیادہ کھری اور دیر پا تھی۔

منا ہے چند دن بعد جب کرنل پیٹرسن کوچی۔ ایچ۔ کیوسے جواب گیا تو موصوف نے
اپنا ہیٹ اتار کر ٹخنے کی بجائے کھالیا! ہڑپ کر کے نہیں، لقمہ لقمہ! واللہ اعلم بالصواب۔

مڈل ایسٹ سیکولر سکول معادی (قاہرہ) میں

صحرا کی لڑائی اور عباسیہ کی "ماکٹائی" کے بعد معادی کی زندگی ایک خواب کی طرح سُہانی زندگی تھی۔ صبح سے دوپہر تک ونگ کا سرکاری کام جو یوں تو شاید ایسا سبک محسوس نہ ہوتا لیکن خود اپنا لباس ہونے کی وجہ سے ایک ولولہ انگیز تفریح بن گیا اور دوپہر کے بعد تو بس ہم تھے اور قاہرہ معادی کے اسٹیشن سے ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک مکلف ڈیزل ٹرین چلتی جو دس منٹ میں قاہرہ کے مرکز یعنی باب لوق اسٹیشن پہنچا دیتی اور پھر ہم قاہرہ کی دُستوں میں کھو جاتے۔

قاہرہ نوردی اس اعتبار سے دو آتشہ ہو گئی تھی کہ لفٹیننٹ پی۔سی۔ درما جو منوں میں ہمارے ہم جماعت تھے، اچانک ایک دن معادی میں آن وارد ہوئے یہ بھی سیکولر افسر تھے اور محاذ پر ایک برگیڈ کے ساتھ تھے لیکن ہندوستان کی آزادی کے ذرا اونچی آواز سے حامی تھے جو ان کے انگریز کمانڈر کو موافق نہ تھا؛ چنانچہ انہیں میدان جنگ میں خطرناک سمجھ کر واپس کمیپ میں بھیج دیا گیا۔ ایسا کر کے برگیڈیئر صاحب نے بڑا کارِ ثواب کیا کہ میں معادی میں ہر چند کہ خوش تھا، تنہا ایسی افسر تھا اور درما سے زیادہ انجمن آرارفتق بنا شکل تھا۔ درما کسی قدر زیر عتاب تھا؛ لہذا اُسے کوئی سرکاری کام نہیں دیا گیا تھا۔ اُس کا واحد شغل ہر شام قاہرہ کے کسی مقام پر انجمن آراستہ کرنا تھا۔ کبھی بادیہ یا گراپی میں کبھی شیریڈ یا کانٹی نیٹل ہوٹل میں کبھی انڈین کلب یا جزیرہ کلب

میں اور کبھی انکلن کے یہاں یا بھابی لٹی کے کلب میں — ان اجنبی ناموں سے تعارف
ابھی تھوڑی دیر میں ہوگا۔

ورما کم بخت نہایت خوش شکل اور گنفتہ مزاج نوجوان تھا۔ کلارک گیل سے خطرناک
حد تک مشابہت رکھتا تھا۔ کچھ خداداد اور باقی اس کی اپنی پیدا کردہ یعنی وہ تیلی لمبی لکیری مونچھ
اور وہ نیم بد معاشانہ سی سنہی جس میں ہونٹ کم اور آنکھیں زیادہ مسکراتی ہیں۔ ورما کی آنکھوں
میں ایک شریر اور دلکش سی چمک تھی۔ وہ جہاں سے گزر جاتا، عورتیں دوبارہ دیکھے بغیر نہ سکتیں۔
ایک روز گراپی میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایک خاتون کچے دھاگے سے کھچی
کھچی آئی اور ورما سے کہنے لگی:

”تم کلارک گیل ہو؟“

ورما تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا اور وہی چشم و لب کی مسکراہٹ کا متحدہ محاذ بنا کر بولا:
”اس کے متعلق تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن جو کچھ پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں
یہ ہے کہ آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔“

ساتھ ہی ورما نے خاتون کے لیے اپنی کرسی خالی کر دی۔ محترمہ بیٹھ گئیں۔ یوں معلوم
ہوتا تھا جیسے ورما کو دیکھ کر ان کی مرادیں پوری ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بیچاری چارڈن سے
ورما سے کلام کرنے کی تمنائیں چکرائی پھرتی رہی ہیں اور ارادے باندھتی اور توڑتی رہی ہیں اور
آج کشتی خدا پر چھوڑ کر منجھار میں اتر آئی ہیں۔ ورما نے انہیں اپنی خوش کلامی سے کنارے پر
لاکھڑا کیا اور وہ دُعا دیتی رخصت ہو گئیں۔ ورما کی زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے
اور اس نے بیسیوں لڑکیوں سے اپنی غلامی کے پیمان باندھے، لیکن اپنی ہرجائی محبت کا پول
نہ کھلنے دیا۔ سوائے ایک نازک موقع کے جس کا ذکر آنے والا ہے۔

ان دنوں قاہرہ میں دیسی افسروں خصوصاً ڈاکٹروں کی خاصی تعداد تھی۔ ان میں سے

ایک میجر وید پر کاش تھے۔ وید درما کی ضد تھے۔ پاٹ چہرہ جو کسی ایکٹر سے مشابہ نہ تھا۔ موبچھ سیدھی سادی شریفانہ بلکہ کسی قدر لالیانہ یعنی کونوں پر مائل پستی رہا عشت، تو بے حد کجائی۔ ایک جگہ ابتداء کی اور پھر وہیں انتہا کر دی یعنی شادی کر لی۔ ہم وید کی شادی میں شریک ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ قاہرہ کی زمانہ کلب کا جزو بدن بن گئے۔

بات یہ تھی کہ ہماری بھابی لٹی جو ایک معزز قطبی خاندان کی بیٹی تھیں، خواتین کلب قاہرہ کی سیکرٹری تھیں۔ یہ کلب کامل پاشا چوک میں ایک وسیع عمارت میں واقع تھیں۔ قاہرہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی بیشتر خواتین اس کی ممبر تھیں۔ ہم وید کے شبہ بالے تھے اور سکر کے دیور، لندا بیبا کا آتے جاتے تھے۔ بھابی لٹی کی بیسیوں سیلیوں سے بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ان میں عیسائی بھی تھیں اور مسلمان بھی۔ سب معزز گھرانوں سے تھیں اور ایک سے ایک خوش وضع اور خوش پوش لندا وید کو اور مجھے کھٹکا لگا رہتا تھا کہ درما کوئی گل نہ کھلائے۔ احتیاطاً ہم نے درما کو قسم کھلائی جو اُس نے بکلائے بغیر کھالی، لیکن درما کا اپنا دل پابند قسم سی حسین و جمیل روزی کے دل پر تو کسی کو اختیار نہ تھا؛ چنانچہ ایک دن روزی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ پہلو سے دل نکال کر درما کے ہاتھ پر رکھ دیا اور جذبات سے مجبور ہو کر اسے بھری مجلس میں کہہ دیا:

”مجھے تم سے محبت ہے اور سخت محبت ہے۔“

ہم نے مذاق میں اڑنے کی کوشش کی تو روزی نے اپنا دامن اشکوں سے بھر لیا۔ ہم نے بھابی لٹی سے رجوع کیا تو روزی کا علاج یہ طے پایا کہ درما کیے از معشوقات کو روزی کے سامنے انگوٹھی پیش کرے تاکہ روزی درما کو دل سے باہر نکال مارے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ ٹونا کامیاب ثابت ہوا اور روزی تیزی سے رُوبصحت ہونے لگی۔

خواتین کی کلب نے ہمیں قاہرہ کے کئی اونچے گھرانوں سے متعارف کرایا۔ ہمیں خصوصاً مصری پاشا کا گھر کبھی نہ بھولے گا جن کے خوبصورت و لاواقع بلیا پولس میں جانے کا کئی مرتبہ

اتفاق ہوا۔ اُن کی دو بیٹیاں حسن و عفت کی تصویریں تھیں ہمیں ماننا پڑا کہ ہر خند کہ نچلے طبقے کے اخلاق جنگ کی نذر ہو گئے تھے اکثر اعلیٰ گھرانوں میں وہی پرانی قدریں تھیں۔ اُن کی بہو بیٹیاں طرح دار بھی تھیں اور وضع دار بھی۔ اُن کی ہم نشینی سے ایمان میں گڑ بڑ کی بجائے تازگی آتی تھی۔ ان میں سے اکثر کالجوں میں پڑھتی تھیں۔ ہم سے گھنٹوں گریبا گرم بحث کرتیں اور اپنی ملائم سی انگریزی میں (جس میں ٹٹ بٹ بٹ بت ہو جاتا ہے) بے حد لہجائیں، لیکن اُن کے سامنے ورماتک دم نہ مارتا۔

ایک دن لاہور سے ہمیں اپنے ایک بزرگ نے خط میں لکھا کہ میرے ایک جگری دوست میجر "ن" قاہرہ میں جنرل ہیڈ کوارٹر میں کام کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ بھی تمہارے چچا ہیں۔ جس قدر جلد ہو سکے اُن سے ملو اور پھر ملتے رہا کرو کہ بہت نیک آدمی ہیں۔ اب بہت نیک آدمیوں سے گولی کی سی تیزی سے جا ملنا گستاخی ہوتی ہے؛ لہذا میں نے تعمیل ارشاد میں کچھ دیر کر دی تو اگلے خط میں لاہور سے ڈانٹ آئی کہ چچا جان سے ملنے میں تاہل کیوں؟ وطن میں تو تم خاصے سعادت مند بیٹے تھے معلوم ہوتا ہے قاہرہ میں تمہاری صحبت کچھ ٹھیک نہیں۔ چچا جان سے بلا تو قف ملو۔

ورما سے ذکر کیا تو بولا: "ٹھیک ہے۔ پچھلے پہر چچا جان کے پاس جانا اور اُن کے ساتھ شام کی نماز پڑھ کر گراپی آ جانا۔"

میں نے کہا: "وہ شاید تہجد کے لیے بھی ٹھہرائیں۔ چلو اکٹھے چلتے ہیں۔ تمہارے بہانے رخصت جلد مل جائے گی۔"

ہمارے ایک دوست میجر لال اتفاق سے اسکل "ن" کو پہچانتے تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر انہیں بھی ساتھ لے لیا۔ چلنے سے پہلے چچا جان کو فون کر دیا کہ میرے ساتھ دو دوست بھی ہوں گے۔

انگل "ن" نے قاہرہ کے ایک گنجان حصے میں پانچویں منزل پر فلیٹ لے رکھا تھا۔ ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر ہو گئی اور کوئی رات کے آٹھ بجے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُن کے دروازے پر جا دستک دی۔ ایک وقفے کے بعد دروازہ کھلا۔ ہمارے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ملل کے کرتے اور ریشمی لنگی میں بلوس کھڑا تھا۔ پاؤں میں پوٹو ہاری زری جوتا اور سر سے ننگا۔

میں جلال آہستہ سے بولے: "یہی انگل "ن" ہیں؟"

میں نے برخوردارانہ لہجے میں اپنا اور دوستوں کا تعارف کرایا۔ جواب میں انگل نے ہم تینوں کو اپنے دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا اور اندر لے چلے۔ ایک گیلری سے گزرے جس کے سرے پر دروازہ تھا۔ انگل نے دروازہ کھولا تو ہمیں کمرہ اور اس کی آرائش نظر آئی۔

قاری محترم۔ ذرا پوچھیں کہ ہم نے اپنے نیک چچا کے ڈرائنگ روم میں کیا دیکھا۔ جائے نماز؟ تسبیح؟ کیا انہوں نے دیواروں پر اسلامی قطععات لگا رکھے تھے کہ روزِ محشر کہ جاں گزارا ہو۔ اولیں پر سب نماز بود؟ یا وہاں الماریاں دھری تھیں جن میں علم و حکمت کے موتی یعنی ہمارے آبا کی کتابیں کھٹی تھیں؟ جی نہیں۔ اس کمرے کا نقشہ کسی قدر مختلف تھا۔ سارے فرش پر دیواروں تک ایرانی قالین پھیلا ہوا تھا اور کمرے کے عین وسط میں ایک براق چاندنی بچی تھی جس کے گرد گاؤتیکے رکھے تھے اور مرکز میں بلور کی کھلے منہ کی صراحی پڑی تھی جس میں چار نرم و نازک ہاتھ ایک مائع گرا رہے تھے۔ یہ مائع بیڑ اور جگر کی بوتلوں سے نکل کر شنیدی میں تبدیل ہو رہا تھا اور انڈیلنے والے ہاتھ چار حسین لڑکیوں کے تھے جن کے چہروں پر تو تبسم تھا لیکن بدن پر کچھ نہ تھا۔ مہانوں کو دیکھ کر تعظیماً اٹھیں۔ اہلاً و سہلاً کہا۔ باادب ایک ایک مہمان کا بازو تھام کر اسے گاؤتیکے ساتھ بٹھایا یا لٹایا اور پھر صراحی سے لبالب جام بھر کر پیش کیا۔ اس اثنا میں میری برخورداری پسینہ کی صورت پھوٹ پھوٹ کر بہ رہی تھی۔ معافی

نگاہ انکل پر پڑی، لیکن اب وہ مہمانوں سے غافل ہو چکے تھے اور اپنے ساتی سے جام پر جام طلب کیے جا رہے تھے۔ انکل کوئی تپا سن پچپن کے پٹیے میں تھے ایک جرمہ پیتے اور شعر دہراتے:

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گسید
تا سحر گاہ زکسار تو جواں بر خیزم

میں نے اپنے نیک انکل کو سرگرم عمل دیکھا تو میرا پسینہ اور تیز ہو گیا۔ میں نے اپنی دشمن ایمان و آگہی کے کان میں کہا کہ اگر ہو سکے تو مجھے تھوڑا سا لہین سکواش پلا دو۔ ورنہ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ لیکن عمر خیام کے گھر میں لہین سکواش کا کیا کام؟ جب سحر ہوئی تو انکل ابھی نہ جواں ہو پائے تھے اور نہ ان کے جاگنے کے ہی آثار تھے۔ چنانچہ انہیں بساط ہوائے دل پر ہی لیٹے چھوڑ کر ہم کیمپ کو سدھارے اور کیمپ میں آکر پہلا کام یہ کیا کہ لاہور والے انکل کو خط لکھا کہ ہم نے اپنی نالائق کی تلافی کر دی ہے اور انکل "ن" کی ملاقات کی سعادت سے عاقبت سنوار لی ہے۔ چند روز کے بعد لاہور سے جواب آیا کہ شاباش جلیتے رہو ہم نہ کہتے تھے کہ صحبت صالح ترا صالح کند۔

انکل "ن" سے تو ہماری پہلی ملاقات آفری ثابت ہوئی، لیکن معادی سے ہر روز قاہرہ جا ہی نکلتے تھے کیونکہ معادی میں انڈین ونگ کی زندگی کی رفتار ایک نرم خرام ندی کی مانند تھی جس کی سطح پر کوئی بلبلا نہ ابھرتا تھا اور سچی بات ہے ایسی بے بلبلا زندگی ہمارے مزاج کو اس نہ تھی لیکن اچانک ایک دن انڈین ونگ کی خاموش زندگی میں ایک بلبلا نہیں ایک غلغلہ پیدا ہوا اور ہمیں قاہرہ جانے کی نہ حاجت رہی اور نہ ہوش۔ کوئی دس بجے کے قریب اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کرنل صاحب نے فون پر اپنے دفتر میں طلب کیا۔ کرنل صاحب کی آواز میں واضح اضطراب تھا۔ حاضر ہوا تو مجھے سامنے بٹھا کر سنجیدہ لہجے میں کہنے لگے:

"کل شام ایک انگریز کارپورل اور ایک انگریز لڑکی معادی کلب کے قریب باغ

میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے کارپورل کو پستول کا نشانہ بنا دیا۔ آج صبح کارپورل ہسپتال میں مر گیا۔ لڑکی کا بیان ہے کہ قاتل شکل و صورت سے ہندوستانی نظر آتا تھا اور اس کے پاس اطالوی ساخت کا خود کار پستول تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قاتل تمہارے ونگ کا جوان ہو۔ ابھی جا کر اپنے جوانوں کو میدان میں "فال ان" کرو۔ میں دس منٹ میں لڑکی کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔ وہ قاتل کی شناخت کرے گی اور شناخت کے بعد انڈین ونگ کے خیموں کی تلاشی بھی لی جائے گی کہ شاید پستول برآمد ہو سکے۔"

یہ سن کر اٹھا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی یہ نہیں کہ اس بد قسمت کارپورل کی تفریح میں مُخل ہونے والے ہم خود تھے بلکہ اس لیے کہ جس پستول سے یہ بد تمیزی کی گئی تھی اسی ساخت اور حلیے کا پستول ہمارے خیمے میں بھی پڑا تھا۔ آپ کا اس پستول سے تعارف ہو چکا ہے۔ اور عین ممکن تھا کہ دوسرے خیموں کے ساتھ ہمارے خیمے کی تلاشی بھی لی جاتی۔

کرنل صاحب کے دفتر سے نکلا تو اپنے ونگ تک آتے آتے تجویزیں بناتا اور ڈھاتا رہا: پستول کو نکال کر باہر ریت میں دفن کر دوں؟ نہیں کوئی دیکھ لے گا۔ نزدیک کے کنوئیں میں پھینک دوں؟ نہیں کوئی سن لے گا۔ اپنے دفتر میں الماری کے نیچے رکھ دوں؟ نہیں کوئی سونگھ لے گا۔ پستول بالکل چھوٹا سا تھا، لیکن اگر سوئی کے برابر بھی ہوتا تو اضطرار میں اس کے تسلی بخش چھپاؤ کی کوئی تجویز ذہن میں نہیں آسکتی تھی۔ بہر حال سیدھا خیمے میں پہنچا۔ پستول نکالا۔ سلیمانی ٹوپی کی بے پناہ ضرورت محسوس کی کہ پستول کو پہنا کر سامنے میز پر رکھ دوں اور کوئی دیکھ نہ پائے شناختی پریڈ کا وقت قریب تھا اور کچھ نہ سوجھی تو پستول کو اپنی بٹکر کی جیب میں ڈال لیا اور شناخت کے لیے چل پڑا۔

وِنگ کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی تین قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور اتنے میں کرنل صاحب مع شناخت کنندہ حسین کے نگرے سے نمودار ہوئے۔ ہم بحیثیت اور سی اُن کے استقبال کو ذرا آگے بڑھے اور معانی خیال آیا کہ ہم افسر ہی لیکن ہندوستانی ہیں اور کسی نہ کسی زاویے سے قاتل سے ضرور مشابہ ہوں گے۔ ناک اور کان بالعموم ہر ہندوستانی کے ایک ہی سانچے کے ہوتے ہیں اور ہم ہی پہلے ہندوستانی ہیں جن پر اس نیک بخت کی نگاہ پڑے گی۔ اگر اُس نے کہہ دیا کہ قاتل سے کچھ ملتا جلتا ہے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اس کے بعد مزید ثبوت کے لیے ہمارے خیمے کی نہیں بلکہ ہماری جیب کی تلاشی کافی ہوگی۔

جی چاہتا کہ کاش استقبال کے دوران لڑکی سے علیک سلیک بھی ہو جائے مگر ہمارے چہرے پر نگاہ نہ ڈالے یعنی ہمارے چہرے سے کچھ ایسا جلال برے کہ اُس کی دید کی تاب نہ لاسکے اور گردن سے اوپر آنکھ نہ اٹھائے لیکن جب قریب پہنچا تو اس بے باک فرنگ نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمارے اندر کے راز بھی پالیے۔ ظاہر تھا کہ ہمارے چہرے سے ابھی جلال کی بارش شروع نہیں ہوئی تھی لیکن ادھر شناختی پریڈ شروع ہو گئی۔

لیڈی کے ساتھ ساتھ ہم بھی جوانوں کے سامنے سے گزر رہے تھے، لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ سپتول جیب بھاڑ کر نیچے کرنے کو ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر سپتول تھام سکتا تھا لیکن کرنل صاحب کے سامنے جیب میں ہاتھ ڈالنا بد تیزی تھی؛ چنانچہ جب تک پریڈ ختم نہ ہوئی ہم اپنی جیب کی استقامت کی دُعائیں مانگتے رہے جو بالآخر مستجاب ہوئیں۔ کیونکہ پریڈ ختم ہوئی تو ہمارے جوان بے گناہ ثابت ہوئے۔ خیموں کی تلاشی بھی ناکام رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اسقاطِ جیب کی شرمندگی سے بچ گئے۔ کوئی دس دن بعد قاتل کسی دوسری جگہ سے پکڑا گیا تو ہم نے اپنے بے گناہ سپتول کو جو ناحق انڈر گراؤنڈ زندگی گزار رہا تھا، روشناسِ خلق کیا اور اُسے لڑپی پہنائے بغیر ڈنکے کی چوٹ میز پر رکھ دیا۔

قاہرہ ○ آخری ایام

۱۹۴۳ء میں ادھر ہم معادی میں انڈین ونگ کی کمان پر چھا رہے تھے اور ادھر
 لیبیا میں لارڈ مننگمری جرمینوں اور اطالویوں کو بھگا رہے تھے اور بانکتے بانکتے انہیں ٹونس اور
 بزدتہ تک لے گئے تھے۔ آگے سمندر تھا۔ سمندر اطالویوں نے سمندر میں گود پڑنے کی بجائے پیچھے دیکھا
 اور ہاتھ بلند کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر میں بیسیوں قیدی کیمپ اسیروں سے بھر گئے۔ ایک کیمپ
 ہمارے قریب بلکہ بالکل ہمارے سایہ عاطفت میں کھولا گیا جہاں سے اطالوی سپاہی ہماری
 خدمت کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ پرائیویٹ برزینی کو ہمارے خیمے اور اس کے مضافات
 کی تزئین کی ڈیوٹی ملی۔ یہی ڈیوٹی ہمارا مستقل اردلی سپاہی محمد اقبال بھی کرتا تھا اور ہزاروں سے
 مگر اس کا انداز کار کچھ دہقانی سا تھا۔ جب برزینی کی آرائش خیمہ دیکھی تو دنگ رہ گئے۔ یوں معلوم
 ہوتا تھا جیسے خود لیوناردو دا ونچی اگر ہمارے خیمے کی مونا لیزا بنا گیا ہو۔ برزینی کی چابکدستی کی تحسین ہم
 نے دافر بگروں سے کی جو جنگی قیدیوں کے لیے ایک نایاب نعمت تھے۔ چند روز گزرے تو
 برزینی نے ہمیں دلکش سا گریٹ لائٹر پیش کیا۔ ہم نے ”نا، نا، نا“ کی زنجیر کے ساتھ بھگریہ
 واپس کیا تو برزینی آرام سے کہنے لگا:

”لے لیجیے، میں نے آپ ہی کی خاطر بنایا ہے۔“

میں نے حیرت سے پوچھا: ”تم نے خود بنایا ہے؟ یہ تو رائسن کے کارخانے کا معلوم ہوتا ہے۔“

بولا: ”رائسن مشین سے بناتا ہے میں نے اپنے ہاتھ اور اپنی ہتھوڑی سے بنایا ہے۔“
برزینی ایک ہنرمند نوجوان تھا اور بعد میں معلوم ہوا کہ ہر اطالوی سپاہی کسی نہ کسی ہنر میں ماہر ہوتا ہے۔ اطالوی سپاہیوں کا یہ معیار دیکھ کر اپنے سپاہیوں کا خیال آیا جو اکثر فنون لطیفہ کو چھوٹے بغیر ہی بالغ ہو جاتے ہیں لیکن سوچا کہ ایسا ہونا بڑا بھی نہیں۔ اگر فنون لطیفہ ہی ہمارے سپاہیوں کے لیے ذریعہ عزت ہوتے تو آج دشمن افسروں کے لیے سگریٹ لائٹ تیار کر رہے ہوتے۔ سپاہی کا پہلا کام لڑنا اور دشمن کے ساتھ وہ سلوک کرنا ہے کہ سگریٹ تو کیا پانی تک نہ مانگے اور اس ہنر میں سپاہی بہادر خاں اور نانک پہلوان خاں کی تھے اور ہیں۔

۱۹۴۳ء کے اواخر میں جنگ افریقہ سے نکل کر اٹلی جا داخل ہوئی تھی اور برزینی کے وطن کی حالت خاصی سلی تھی۔ البتہ جرمن بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے اور ہٹلر سویٹزی گوئڈ پر اٹھا کر اہل روم کو تباہ ہاتھ کہہ رہا تھا کہ تمہارا ال ڈیوچے ہمارے ساتھ ہے لیکن اطالوی اب ہر قیمت پر امن اور سویٹزیوں کے لیے بیتاب تھے؛ چنانچہ ایک دن اچانک اطالوی فوجوں نے ہٹلر سے آنکھ بچا کر قرینے سے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ خبر ہم تک ایک عجیب انداز میں پہنچی۔

اس شام ہمارے میس میں بڑا ڈنر تھا۔ کوئی سو سے زیادہ افسر کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ رسمی ڈنر تھا، خاموشی تھی اور افسریوں تن کر بیٹھے تھے کہ کپڑوں کے علاوہ جسم کو بھی کلف لگا کر آگے ہوں۔ اچانک ساتھ کے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ کسی بیرے نے فون لیا تو دوسری طرف سے مطالبہ ہوا کہ کوئی افسر آ کر بات کرے۔ میں دروازے کے قریب بیٹھا تھا۔ اٹھا اور جا کر رسیور کان سے لگایا۔ ایک ہیجان خیزی آواز سنا دی۔ بولنے والے کیپٹن جارج تھے۔ ہمارے کیمپ کے ڈیوٹی افسر۔ مجھے پہچان کر کہنے لگے:

”خبر سنی ہے؟“

”کون سی خبر؟“

”تو پھر نہیں سنی اور سُنو:“

“OLD MUSSO HAS HAD IT”

پھر تشریحاً بتایا کہ اٹلی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ذرا ڈائمنگ ہال میں اعلان کر دو۔
میں ہال میں واپس آیا تو دروازے میں کھڑے ہو کر دانتہ طور پر ذرا ڈرامائی انداز میں بولا:
”حضرات توجہ! ابھی ابھی ڈیوٹی افسر نے خبر دی ہے کہ اٹلی نے آج سات بجے

ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“

میرے منہ سے اس جملے کا نکلنا تھا کہ وسیع ہال میں ایک غلغلہ بلند ہوا۔ تمام افسر مع
ہمارے وضع دار کرنل صاحب کے کرسیوں سے اُٹھے۔ جو کچھ ہاتھ میں آیا: پھریاں، کانٹے،
پلیٹیں، نپکن، چھت کی طرف اُچھال دیا اور خود ناچنے لگے۔ انگریز عجیب جانور ہے
سنجیدگی کے موقع پر کبھت برف بن جاتا ہے کیا مجال جو رسوم و قیود سے ہٹ کر بات کرے؟
لیکن تفریح کا مقام ہو تو اس سے کوئی بے اعتدالی، کوئی بد پرہیزی اور کوئی بے وقوفی بعید
نہیں۔ کچھ دیر بعد ہنگامہ فرو ہو تو بیروں نے پھریاں کانٹے چُن چُن کر دوبارہ آراستہ کیے۔
کھانا ختم ہوا تو شراب کے دور شروع ہوئے جو رات بھر جاری رہے۔ انگریزوں
نے تو خیر دشمن کو شکست دی تھی، ہم نے کیا پایا تھا؟ غیر ارادی طور پر اس خوشی میں بھی غیر جانبدار
ہی رہے۔ موقع پا کر باہر نکلے اور خیمے میں جا کر سو گئے۔

اگلی صبح برزینی سے مُلاقات ہوئی۔ خیال تھا بے چارے شکست خوردہ برزینی کو
ہمدردی پیش کریں گے، لیکن برزینی خوشی سے چمک رہا تھا۔ حیرت ہوئی اور وحس انبساط
پُرمچی تو بولا:

○ مسولینی کا بیڑا غرق ہو گیا ہے!

”جنگ ختم ہو گئی ہے۔ اب جلد ہی اپنی سویٹ ہارٹ سے بلوں گا۔“
 اور یہ کہہ کر میری میز پر ایک مُکراتی اطالوی لڑکی کی تصویر رکھ دی اور ساتھ ہی کسی
 قدر دعوے کے ساتھ کہنے لگا: ”یہ میرا انتظار کر رہی ہے۔“

یہ دعویٰ دراصل برزینی کی اپنی تسلی کے لیے تھا اور حقیقت میں انگریزوں کا گزشتہ
 رات کا طرب بھی اتنا قومی نہ تھا جتنا ذاتی۔ ہر انگریز کو یہی خیال تھا کہ وہ جو پیچھے انگلستان میں
 بیٹھی ہے، واقعی انتظار کر رہی ہے یا کسی دوسرے نے اس انتظار کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انگریزوں
 کو امریکی سپاہیوں سے خصوصی خدشہ تھا جو ان دنوں انگلستان میں دخل در معقولات دے رہے
 تھے۔ جنگ میں زخمیوں اور مردوں کی تعداد کا بڑی احتیاط سے ریکارڈ رکھا جاتا ہے
 لیکن ان دلوں کا شمار نہیں کیا جاتا جو طویل جدائیوں اور ارازی مثلث کے کوششوں کی وجہ
 سے لڑتے ہیں۔

شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

مجھے اس کرب کا اندازہ اس وقت ہوا جب ایک عرصہ کے لیے مجھے اپنی یونٹ
 کے گورے سپاہیوں کی ڈاک سنس کرنے کی ڈیوٹی دی گئی۔ ہر چٹھی ایک آہ تھی۔ ہر سطر ایک فریاد۔
 ”میری محبوبہ، مجھے بھلا نہ دینا۔“

”میری جان، میرا انتظار کرنا۔“

”میری دلربا، امریکنوں سے بچ کر رہنا۔“

مسلینی کی شکست میں ہر انگریز کو وہ لمحہ قریب نظر آیا جس سے پیشتر کہ اُس کی محبت
 پر کوئی غیر ڈاکہ ڈال دیتا۔ بس اتنی سی بات پر یہ اظہارِ طرب تھا۔ لیکن دل کی دنیا میں ہی تو
 بڑی بات ہے۔ انگریزوں کا یہ خوف بجا بھی تھا۔ ایک تو برطانوی اخباروں میں انگریز
 لڑکیوں اور امریکی سپاہیوں کی باہمی موانست کے قصے بلکہ تصاویر چھپتی تھیں جنہیں دیکھ کر انگریز

فوجیوں کے دل چھلنی ہوتے تھے۔ دوسرے خود قاہرہ میں ان امریکیوں نے (جو ابھی ابھی نازل ہوئے تھے)، اپنے ڈالروں اور چیونگ گم کے طفیل تمام مصری معشوقاؤں کو انگریزوں سے چھین لیا تھا۔ وہی لڑکیاں جو قاہرہ کی رقص گاہوں اور رستورانوں میں انگریز افسروں کی ہم نشینی پر کبھی ناز کرتی تھیں، اب جگالی کرتے ہوئے امریکی سارجنٹوں بلکہ سپاہیوں کی بغل میں جواہی جگالی کرتے ہوئے چلتیں اور پاس سے گزرتے ہوئے انگریز افسروں کو رحم اور حقارت کے ملے جلے جذبات سے دکھتیں۔ بلکہ کئی شوخ طبع لڑکیاں انگریزوں کے جوش رقابت کو بھڑکانے کے لیے اپنے سینوں پر پیتل کے بنے ہوئے حروف U.S. لگا لیتیں۔

— یہ حروف امریکی فوجی اپنے کالر پر لگایا کرتے ہیں — انگریزوں سے اور کچھ بن نہ پڑا تو ان لڑکیوں کو UNSERVICEABLE یعنی ناقابل استعمال کہنے لگے کہ برطانیہ کی فوجی لغت میں U.S. اسی لفظ کا مخفف ہے اور "کنڈم" مال کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ محض دل کو جھوٹی تسلی دینے کی بات تھی۔ حاشا وہ لبنان مصر کسی زاویے سے بھی ناقابل استعمال نہ تھیں۔ پھر جس بلندی پر انہوں نے یو۔ ایس کا بلا لگا رکھا تھا، انگریزی پھبتی کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہ تھی۔

انگریزوں اور امریکیوں کی چشمک نے بیشتر لطیفے پیدا کیے۔ انگریز امریکیوں کو جنگی نقطہ نظر سے انارٹی سمجھتے تھے اور ان کے لیے اکثر YELLOW یعنی بزدل کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ امریکی اس پر ہنس دیتے اور اپنی چھاتیوں پر تمغوں کی طرف اشارہ کرتے لیکن تمغوں کی عنایت کے معاملے میں خداوندان امریکہ بہت فیاض واقع ہوئے ہیں۔ ایک امریکی سپاہی اگر دو سال نوکری کرے تو اس کی چھاتی پر قوس قزح اتر آتی ہے۔ چنانچہ انہیں دنوں جب قاہرہ میں جنرل منٹگری کی فتح یبیا کے متعلق فلم دکھائی جانے لگی تو انگریزوں نے ازراہ

UNITED STATES O کا مخفف

تفّٰن مشہور کر دیا کہ امریکی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو امریکی سپاہی فلم
 DESERT VICTORY دیکھ لے گا اُسے تمغہ دیا جائے گا؛ لہٰذا سینما ٹکٹ کا کونٹر قابل ضائع نہ
 کیا جائے۔ امریکیوں نے اس مذاق کا جواب بعد میں سولوز کے مقام پر دیا جہاں جرمن
 گولوں کی بارش میں اتر کر زور بازو سے جرمنوں کو میلوں دھکیل کر پیچھے لے گئے۔

اس کے بعد قیام قاہرہ کے دو ہی قابل ذکر واقعات ہیں۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں لفٹیننٹ
 درما کا اور دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہمارا اپنا عازم وطن ہونا۔ درما کی ہر حرکت میں ہنگامہ
 ہوتا تھا لیکن کہنے لگا کہ میری روانگی پرائیویٹ ہوگی۔ تمہارے بغیر کوئی الوداع کہنے نہیں
 آئے گا۔ میں اپنی جیب میں اُسے قاہرہ اسٹیشن کو لے چلا تو راہ میں کہنے لگا: ”ذرا فیفنی
 (FIFI) کو بھی ساتھ لے لیں۔ میں نے اُس سے وعدہ کر رکھا ہے۔“

فیفنی درما کی چہیتی دوست تھی؛ چنانچہ فیفنی کو بھی ساتھ بٹھالیا لیکن اسٹیشن پر پہنچے تو
 دیکھا کہ تین اور فیفیاں علیحدہ علیحدہ کھڑی ہیں۔ درما کو علم نہ تھا کہ اُس کی باقی معشوقائیں بھی اُسے
 الوداع کہنے آئیں گی۔ ادھر ہر ایک ہی سمجھے بٹھٹی تھی کہ وہی درما کی واحد دوست ہے جو
 خدا حافظ کہنے کو پہنچی ہے۔ چنانچہ جونہی انہوں نے درما کو دیکھا، مختلف سمتوں سے اُس کی
 طرف بڑھیں۔

وہ جو سب سے پہلے پہنچی، درما سے لپٹ گئی اور تراخ سے درما کے رخسار پر
 ایک باواز بوسہ داغ دیا۔ اصلی فیفنی سے یہ دیکھا یا سنا نہ جا سکا تو اُس نے بوسہ گیر فیفنی کے
 ایک تھپڑ لگا دیا اور اُس سے گتھم گتھا ہو گئی۔ درما انہیں علیحدہ کرنے لگا، تو ایک تیسری فیفنی
 آگے بڑھی اور درما کو اپنی طرف کھینچ کر بولی کہ ”جانے دو ان جھگڑاؤں کیوں کو اب مجھے الوداع
 کہنے دو۔“ لیکن بیچاری الوداعی رسوم کی ابتداء بھی نہ کر پائی تھی کہ آخری اور چوتھی فیفنی نے حق شغفہ
 ○ یعنی صحرائی فتح۔ یہ جنرل منٹگری کی فتوحات کے متعلق انگریزی فلم تھی۔

کے طور پر ورماکو پیٹی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ غریب ورم میدان جنگ سے تو سالم واپس آ گیا تھا لیکن میدان محبت میں اُس کے پُرزے اڑنے لگے۔ دیکھنے والوں کو رحم آیا تو منہ زور فیفیوں کو یکے بعد دیگرے لگام دی اور ورماکو مشکل ریل کے ڈبے تک پہنچایا۔

ورما ڈبے میں بیٹھا ہی تھا کہ اُس فیفی نے جو سب سے پہلے سنبھلی، اپنی انگوٹھی اتار کر ورم کے منہ پر دے ماری۔ یہی حرکت دوسری اور پھر تیسری فیفی نے کی اور پلیٹ فارم سے باہر چل دیں۔ ورم ان بردہ پیشہ معشوقوں کی قطار کو جاتے دیکھ کر غالب کی سہنوائی میں کہہ سکتا تھا:

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

مگر وہ جو اصلی فیفی تھی اُس کی محبت اُس کے جذبہ رقابت پر غالب آئی۔ لپک کر ڈبے میں پہنچی۔ اگرچہ خود بھی خستہ تن تھی لیکن بڑھی اور رنجور مسافر کے سر کو اپنی آغوش میں لے کر اُس پر گھنی پلکوں کا سایہ کر دیا۔ غریب ورم نے قدرے آسودگی محسوس کی اور آنکھ کھولی۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چہینہ غریبِ لوطنی ہوتی ہے

لیکن ایک بات واضح تھی کہ غریبِ الوطنی میں اتنے وسیع پیمانے پر عاشقی کرنا جان جو کھوں کا کام ہوتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد گاڑی سونیز کو روانہ ہونے لگی تو فیفی نے ڈبے سے اتر کر ایک تررو مال ہلانا شروع کیا۔ ہم نے یہ منظر دیکھا تو ہمیں اپنے دوست کی جدائی کے علاوہ بکیسی عشق پر بھی بے اختیار رونا آیا۔

کوئی مہینہ بھر بعد اسی ٹرین سے ہم عازمِ وطن ہوئے۔ خدا جانے یہ افسوس کا مقام ہے یا فخر کا کہ ہم نے کسی فنٹ ایڈ کے استعمال کے بغیر قاہرہ کو الوداع کہا۔

Handwritten text in Urdu script, appearing to be a collection of verses or a poem. The text is very faint and difficult to read accurately. It seems to contain religious or philosophical content, possibly related to the Quran or Islamic teachings. The lines are arranged in a vertical column, typical of handwritten Urdu poetry or prose.

مراجعت بہ وطن

۲۳ دسمبر ۱۹۴۳ء کو جب ہمارا جہاز ایسکانیس (ASCANIUS) سویزی کی بندرگاہ سے بحیرہ قلزم کو روانہ ہوا تو ہم اس کے سینکڑوں انگریز مسافروں میں تقریباً واحد سی تھے لیکن جس خوشی سے یہ واحد دل ٹپ رہا تھا وہ ان سینکڑوں انگریزی دلوں کو میسر نہ تھی۔ وجہ صاف تھی کہ ہم جنگ سے وطن کو لوٹ رہے تھے اور انگریز وطن سے جنگ کو جا رہے تھے یعنی برما کے محاذ پر۔ اس روز ہمارے لیے پورے اڑھائی برس کے بعد وطن کی دید کا خیال کس قدر نشاط انگیز تھا! اتفاق سے اس سمندری سفر میں ہماری تفریح کے سامان ہماری توقع بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ نکلے لیکن مراجعت وطن کی مسرت ان عارضی خوشیوں سے بالا اور برتر ہی ہے۔

ہمارے ہم سفروں میں خاصی تعداد خاکی پوش انگریز لڑکیوں کی بھی تھی جو ہندوستان اور برما میں مختلف جنگی خدمات کے لیے جا رہی تھیں یعنی کچھ نرسیں، کچھ ڈاکٹر، کچھ سیکرٹری وغیرہ۔ اگرچہ ان میں سے کئی ایک خاکی وردی میں بھی خورشید و ماہ لگتی تھیں، لیکن وہ جن کے دم سے یہ روزہ سمندری سفر ایک گلگشت میں بدل گیا یہ باوردی اجرام فلکی نہ تھیں بلکہ انسا (ENSA) کے باکمال ایکٹر اور باجمال ایکٹریں جو اسی جہاز میں برما کے محاذ پر اپنے برٹش ٹامیوں کو تفریحاً ہم

○ انٹرنیشنل نیشنل سروس ایسوسی ایشن

پہنچانے جا رہی تھیں۔ جنگی خدمت کے سلسلے میں یہ برطانوی تھیٹر کی پیش کش تھی۔

مسلل جنگ اور مورچہ گیری سے سپاہی ایک رُوحانی فائقے کا شکار ہو جاتا ہے جو دشمن کی گولی سے بھی مہلک تر ہوتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بیچارے کو جس دل پہ ناز ہوتا ہے وہ دل نہیں رہتا۔ یہ انسا کمپنیوں کے تماشے اسی بے دلی کا درماں تھے۔ جنگ میں سپاہی کے لیے عورت کی دید سے بڑھ کر کوئی دوائے دل نہیں اور انسا کی ایکٹریس اس نکتے سے آشنا تھیں یا آشنا کر کے بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب کبھی دیدارِ عام کا اہتمام کرتیں تو کچھ چھپا کر نہ رکھتیں۔ اُن دنوں ٹاپ لیس سوٹ کا رواج نہ تھا تاہم کسی سپاہی نے انسا کی ایکٹریسوں سے تیرکایت نہ کی کہ وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

یہی رعایتیں اس سمندری سفر میں بھی روا تھیں بلکہ گرمس کے موسم کی وجہ سے اتر کر دی گئی تھیں۔ اس موسم میں انگریز پاسبانِ عقل کو تنہا ہی نہیں چھوڑتا بلکہ دھکا دے کر اُسے سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔ چنانچہ پورے سفر میں صبح سے شام تک تفریحات کا سلسلہ تھا کہ ختم نہ ہونے پاتا تھا۔ جرمن آبدوزوں کا خطرہ تھا لیکن اس کا احساس سوائے سنتری کے کسی کو نہ تھا اور سب تو یہ ہے کہ جرمن آبدوزوں کے کپتانوں کو اگر ہمارے جہاز کے حالاتِ دروں کا علم ہوتا تو تار پیڈ و بھیجنے کی بجائے خود کھینچے آتے۔ بہر حال سارے سفر میں دشمن کی آبدوز کے متعلق صرف ایک ہی الارم ہوا اور الارم ہوتے ہی اہل جہاز نے پلینے، ناچنے اور گانے کی قنات اور تیز کر دی تا آنکہ ”آل کلیئر“ کا سگنل ملا اور سکون کے وقفے کا اعلان ہوا۔

سفر کی ایک رات یعنی ۳۱ دسمبر کی رات بھولنے کی نہیں۔ سالِ نو کے خیر مقدم کی تقریب تھی۔ اُس شب عقل کے ساتھ شرم کو بھی غرقِ دریا کر دیا گیا اور دلوں کو جملہ رسوم و قیود سے پیش چھٹی ملی۔ نیم شب کی ساعت آئی تو اہل جہاز کے جنون کا سلسلہ اس قدر دراز ہو چکا تھا کہ دامن کے چاک اور گریبان کے چاک کا فاصلہ ناپید تھا۔ اس بے حجابی میں خواتین نے دُورا

نمبر لیا گوارا نہ کیا۔

مست کب بند قبا باندھتے ہیں !

۴ جنوری ۱۹۴۴ء کی صبح کو ہمارا جہاز آہستہ آہستہ بمبئی کی گودی میں داخل ہوا۔ میں ایک مختصر سی نیند سے جاگا تو پورٹ ہول سے خشکی نظر آئی۔ ایک بیانی کے عالم میں کپڑے پہنے، عرشے پر بیٹھا۔ ارض ہند پر نگاہ پڑی تو آنکھوں میں دفرِ مسرت سے آنسو چھلک اٹھے اور جب بالآخر خاکِ وطن پر پاؤں رکھا تو خدا جانے کتنی دیر احساس رہا کہ پاؤں کی بجائے جبین کیوں نہ رکھ دیں۔ بمبئی میں ہمیں ٹرانزٹ کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔ یہ وہی کیمپ تھا جہاں اڑھائی سال پہلے ہماری دعا گو کسی بابو مزاج فرشتے نے محض ٹائپ کی غلطی کی وجہ سے خدا تعالیٰ تک جانے سے روک دیا تھا اور ہمارا سمندر پار کا سفر نہ ٹل سکا تھا۔ بہر حال اب خوش تھے کہ نہ صرف جنگ سے بچ کر آگئے تھے بلکہ کسی قدر سچا لو لگا کر انگریزی غازی بھی بن چکے تھے اور طبیعت میں ایک قسم کی خان بہادری محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ کیمپ کے دفتر میں داخل ہوئے تو اندر اس بے تکلفی سے قدم رکھا گویا صاحب خانہ ہمیں ہیں اور انگریز کمانڈنٹ نے بھی ہمیں خوش آمدید کہا تو اس تپاک سے گویا ملکِ معظم نے ذاتی طور پر ہماری خاطر ہدایات بھیجی ہوں۔ ملاقات کے دوران ہمیں کمانڈنٹ صاحب نے سگنل ٹریننگ سنٹر سیالکوٹ میں تقریر کا حکم نامہ دیا۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے ایک ماہ کی رخصت کا مزدہ بھی سنایا اور اسی شب فریٹر میل سے ہماری نشست کا انتظام بھی کر دیا۔

دوسرے روز لاہور پہنچے۔ ہماری منزل تو آگے چکوال تھی جہاں سے اتر کر اپنے گاؤں بل کسر

○ اُس وقت پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

● بل کسر ایک دلکش سا قصبہ ہے جو چکوال سے بارہ میل مغرب میں واقع ہے اور اپنے تیل کے

چشموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک تیل کے چشمے بل کسر کی وجہ سے مشہور ہیں۔

جانا تھا لیکن گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر رُک کر اور ہم نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ہمیں وہی کالج کے دنوں کے مانوس درو دیوار نظر آئے۔ وہی رَس بھری پنجابی آوازیں کانوں میں پڑیں اور وہی بھاگ بھری قمیصیں اور شلواریں دکھائی دیں۔ ایک غیبی طاقت نے ہمیں لاہور اترنے پر مجبور کر دیا۔ اسٹیشن سے نکل کر چلے تو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ لاہور کے کوچوں میں چلنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے لاہور ٹھہرے۔ ٹھہرے کیا، اپنے آپ کو لاہور کے سپرد کر دیا اور یوں محسوس ہوا جیسے ہوئے لاہور ہماری سہ سالہ اجنبیت کو دھو کر ہماری باضابطہ تطہیر کر رہی ہے۔ دوسرے روز گھر پہنچے تو چھوٹوں کو بڑا پایا اور بڑوں کو اور بڑا لیکن گاؤں کی بڑی خبر یہ نہ تھی کہ ہم نے انہیں کیا پایا بلکہ یہ کہ ہم خود کیسے پائے گئے۔ خبر مشہور ہو گئی کہ کپتان آگیا ہے۔ محمد خان آگیا ہے۔ کتنا ڈبلا پتلا تھا، اب دیکھو کیا جوان نکلا ہے۔ صاحب بن گیا ہے۔ برگٹ بھی پیتا ہے۔ مسکوٹ میں کھانا کھاتا ہے۔ نوکری پرہ بھی معاف ہے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے چلتے کام چھوڑ کر ملاقات کو آنے لگے۔ ہم نے پہلے دو دن میں کوئی ایک ہزار معائنے کیے ہوں گے اور بس اتنی ہی ہمارے گاؤں کی مردانہ آبادی تھی۔ چھاتی دُکھنے لگی لیکن دل کو ایک عجیب ٹکھ حاصل ہوا۔ مہینے بھر میں صرف چند روز اپنے گھر سے کھانا کھایا اور وہ بھی والد کے اصرار پر کہ مجھے اپنے بیٹے کو جی بھر کر دیکھ لینے دو اور جب بہت دیر دیکھ چکیں تو وہی کچھ کہا جو صرف ماں ہی کہہ سکتی ہے: ”بتلیا، اب ساری فوج میں تم ہی بڑے افسر ہونا؟“

میں والدہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اگر اس پکیرِ محبت کا وجود نہ ہوتا تو کیا مجھے وطن کی واپسی کا یہی اشتیاق ہوتا؟ بغیر کسی جھجک کے جواب دیا: ”جی مان! ایک آدھ چھوڑ کر سب میرے ماتحت ہیں۔“ اور ماں کی دُنیا آباد ہو گئی۔ ویسے سچ یہ تھا کہ ایک آدھ نہیں بلکہ ایک لاکھ چھوڑ کر بھی ہمیں اپنے ماتحت ڈھونڈنے کے لیے چراغِ بلکہ سرچ لائٹ کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ سچ کس کام کا جس سے ماں کا دل دُکھے؟

سیالکوٹ میں ایک سال

مہینے کی چھٹی پل بھر میں گزر گئی۔ سیالکوٹ کی تیاری کی۔ معاوی کے سگنل سکول میں ہم نے جس کیپٹن اڈرا سنگھ کی جانشینی کی تھی وہ ان دنوں سگنل ٹریننگ سینٹر سیالکوٹ میں مستعین تھے انہیں تار دیا کہ پہلے روز آپ کے یہاں ٹھہروں گا اور روانہ ہوا۔

اڈرا سنگھ قیام قاہرہ کے دنوں میں اپنی بیوی کی بد صورتی کے قصے سنایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ مقابلہ حسن کرنے والے کبھی بد شکل خواتین کا مقابلہ بھی کر ڈالیں تو میں اڈرا سنگھ کے ملکہ منتخب ہونے کا نہایت قوی امکان ہے اور پھر اپنی بیوی کے حق میں ایک غائبانہ آنکھ مار کر شرارتاً یہ مصرع الاپتے:

جتنے لچھی پیر رکھ دی، اوتھے اگ داسرودا بوٹا

میں یہ سمجھ کر مسکرا دیتا کہ شاید یہ سردار جی کی دل لگی کا انداز ہے ورنہ سردار نی بالکل بے قصور ہوگی۔

لیکن سیالکوٹ پہنچا اور بھابی جان کو دیکھا تو کیپٹن اڈرا سنگھ کی سخی گوئی کے علاوہ ان کی مظلومیت اور نفس کشی پر بھی یقین آگیا۔ ظاہر تھا کہ محترمہ کج رُخان جہان میں بہت اونچا

○ جہاں لچھی پاؤں رکھتی ہے وہاں سرودا پودا اگ آتا ہے۔

مقام رکھتی ہیں۔ ذاتی کشش کا یہ عالم تھا کہ اگر موصوفہ رُخ روشن کے سامنے شمع کی بجائے بھینس کھڑی کر کے پروانے کو دعوتِ انتخاب دیتیں تو پروانہ بے تحاشہ بھینس سے چمٹ جاتا۔ ویسے کیپٹن صاحب کو ایک اطمینان تھا کہ اگر کسی وجہ سے انہیں محترمہ کو شہریابن میں تنہا بھی چھوڑنا پڑا تو ان کی عصمت کا بال بیکا نہ ہوگا۔ کپتان صاحب دوست پرور آدمی تھے۔ ہر نئے دوست کو گھر لے جانے سے پہلے آنے والے صدمے سے آگاہ کر دیتے تھے کہ اچانک تعارف سے غریب کا دل فیل نہ ہو جائے۔ میں تو ایک سال سے اس حادثے کی تیاری کیے بیٹھا تھا، لہذا میرا دل فی الحال متحرک تھا۔

بعد میں جب منزا اور اسنگھ سے مزید واقفیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ کپتان صاحب اتنے بدنصیب نہ تھے جتنے ہم سمجھتے تھے۔ منزا اور اسنگھ نے تقسیمِ حُسن کے وقت بیشک شدید غصت برتی تھی لیکن عقل بٹتے وقت اس خاتون نے مستعدی کے علاوہ کسی قدر سگھا شامی سے بھی کام لیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دنیوی معاملات میں افلاطون کو بھی دو چار کام کی باتیں بتا سکتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ماجھے کی صحت مند جی تھی۔ عقل اور صحت کی اس نادر آمیزش نے ایک اور قسم کا حُسن پیدا کر دیا تھا جو حُسنِ صورت سے کہیں زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعد میں منزا اور اسنگھ کے احترام میں ان کی شکل کبھی حائل نہ ہوئی۔

دوسرے روز دفتر گئے۔ کمانڈانٹ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بولے:

”اچھا ہوا تم وقت پر آگئے۔ کیپٹن رینر (RAINER) آج ہی رخصت

ہو رہا ہے۔ اس سے چارج لے لو۔“

میں سمجھا کوئی کپنی ملے گی اور مزے سے کمان کریں گے، مگر رینر کے پاس پہنچا تو کوئی گز بھر لمبے اور اتنے ہی چوڑے رجبڑ، ہی کھاتے، رسیدیں اور کچھ نقدی اٹھالایا اور میرے حوالے کرتے ہوئے بولا:

○
"WITH LOVE TO THE NEW ACCOUNTS OFFICER"

مجھے معلوم تھا کہ فوج میں لڑنے کے علاوہ بیسیوں قسم کے دوسرے پاڑے بھی بیٹھے پڑتے ہیں لیکن ایک لاغری امید تھی کہ ابھی ان حساباتی پاڑوں سے ذرا محفوظ رہوں گا، لیکن اب جب کہ بیٹنا ہاتھ میں تھا اور پاڑے سامنے رکھے تھے، کوئی مفرزہ تھا۔ چپکے سے چارج پر دستخط کر دیے اور سگنل ٹریننگ سنٹر کے اکاؤنٹس افسر بن گئے۔

رجسٹر کے اندر جھانکا تو معلوم ہوا کہ اکاؤنٹس افسری تو سراسر علم دریاؤں ہے۔ مثلاً یہ کہ اس میں کوئی جادو ہے جس کا نام ڈبل انٹری ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سنڈری کریڈیٹ کھلاتے ہیں اور کبھی سنڈری ڈیٹ بن جاتے ہیں۔ حیران ہو کر سوچتا کہ الٹی یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں اور یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے۔ لیکن قصہ مختصراً اکاؤنٹنگ کے جملہ اسرارِ نہاں ہم پر آخر تک آشکارا نہ ہو سکے۔ ہفتہ بھر کی بے نتیجہ جمع تفریق کے بعد اپنے دل سے کہا کہ میں کہاں اور یہ وہاں کہاں؟ یہی کھاتے اٹھا کر سیدھا خداوند سنٹر کے پاس پہنچا اور عرض کی کہ اکاؤنٹس افسری اس خاکسار کے بس کا کھیل نہیں۔

خداوند نے مسکرا کر فرمایا: "بغیر بس کے ہی کھیلو۔"

اور ہمارا کندھا تھپکا کر رجسٹر ہمارے حوالے کیے۔ واپس دفتر میں آیا اور اپنے یونٹ اکاؤنٹنگ جگدیش لال سے پوچھا:

"میاں، بغیر بس کے اکاؤنٹس کیسے کھیلے جاتے ہیں؟"

مسکرایا اور بولا: "جیسے آپ سے پہلے رینز صاحب کھیلے تھے۔"

اس کے بعد جگدیش لال رجسٹر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد مکمل کر لیا اور بولا: "جہاں ضرب کا نشان ہے ذرا دستخط کر دیں۔" دستخط ہو گئے تو کہنے لگا:

○ نئے اکاؤنٹس افسر کی خدمت میں محبت کے ساتھ

”آج کا کام ختم سمجھیں۔“

خدا کا شکر ہے جگدیش لال دیانندار آدمی تھا جس کے سہارے ہم نے سال بھر
نمایاں کامیابی کے ساتھ اکاؤنٹس افسری کی۔ پھر چانک ایک نئے کپتان صاحب سنٹر
میں تشریف لے آئے اور ہم نے اپنے پیش رو کی تقلید کرتے ہوئے تمام تر جبر اور ہی کھاتے
مع اپنی بے پایاں محبت اور خلوص کے اُن کے سپرد کر دیے اور کلمہ شکر پڑھا۔ ویسے اگر
آپ سنٹر کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ہماری اکاؤنٹس افسرانہ خدمات کا ذکر سنہی الف باط
میں رقم ہوگا۔

ہیں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سیالکوٹ کی زندگی میں محاذِ جنگ کی تکالیف نہ تھیں لیکن جنگ کے تکلفات
تمام تر موجود تھے۔ مثلاً بغیر وردی کے گھر سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ کلب جاؤ تو وردی میں اور
بازار جاؤ تو وردی میں۔ سفید شریفانہ کپڑے پہن کر باہر نکلنے کو دل ترس گیا تھا۔ چنانچہ کئی تیز
رات کو گھر کی تنہائی میں سوٹ پہنا، آئینے میں دیکھا، دو حسرت کی آہیں بھریں۔ سوٹ اتار
کر صندوق میں بند کر دیا اور منہ بسور کر پھر خاکی وردی پہن لی۔ گویا اپنی کپتانی کا اشتہار
زیب تن کر لیا۔

زندگی کی بے شمار چھوٹی چھوٹی خوشیاں صرف گمانی میں ہی میسر آ سکتی ہیں۔ مثلاً چوک
میں کھڑے ہو کر سلاجیت نیچنے والے کا لیکچر سنا اور علی الاعلان نسخہ بنوانا، بندریا کالنج دیکھنا
اور کھلکھلا کر ہنسنا، استاد گام کی دکان سے سر بازار کباب کھانا اور اپنی آسودگی کی تصدیق ایک
برہنہ ڈکار سے کرنا، سکیٹڈل پوائنٹ پر کھڑے ہو کر ڈنکے کی چوٹ دل کی دھڑکن سنانا اور
اور گالی کھا کر بے مزانہ ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوچہ دلدار کے چکر کاٹنا اور شکل و صورت

سے یوں دکھائی دینا جیسے خدمتِ خلق کے لیے مارے مارے پھر رہے ہوں۔ لیکن فوجی یونیفارم پہنی ہو جو کلفت سے کڑکڑا رہی ہو اور کپتانی کا آگینہ شانوں پر اٹھا رکھا ہو تو پہلا کباب کھاتے ہی، پہلی دھڑکن دھڑکتے ہی اور پہلا چکر کاٹتے ہی یہ آگینہ چور سمجھیں اور اگر کورٹ مارشل کی نوبت آگئی جو ضرور آنی چاہیے تو پھر کپتانی ہی کا فور سمجھیں۔ چنانچہ ہم فقط ان خوشیوں کی ہی تمنا کر سکتے تھے جن تک باوردی رسائی ممکن تھی۔ سوائے اس کے کہ کوئی خوشی یا ناخوشی از خود غریب خانے پر آدنک دے۔

اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن ہمارے بنگلے کے صحن میں ایک تانگہ آکر رکا۔ تانگے میں سامنے کی نشست پر کوچوان کے علاوہ ایک خاصی معمر خاتون سوار تھیں۔ تانگے سے اترے بغیر مجھ سے مخاطب ہوئیں:

”تم ہونا کپتان؟“

عرض کیا: ”جی ہاں، ارشاد؟“

اور حیران تھا کہ خدا جلنے آج کس بلانے خانہ انوری کو انتخاب کیا ہے۔ بڑی بی نے جواب میں بے تامل پتھر دے مارا:

”تو شرم نہیں آتی؟ اس بچی کا دل توڑ دیا۔“

یہ کہہ کر محترمہ نے ایک دسویں سی آہ بھری اور پھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں وہ بچی بیٹھی تھی۔ میں نے اس بچی کو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا لیکن اب دیکھا تو ایسی بچی بھی نہ تھی۔ کوئی اٹھارہ سال کا سن۔ شکل کی شریف مگر آنکھوں کی شریہ۔ وہی کانزٹ سکول کی آزادی اور خود اعتمادی کی مہر لگی ہوئی۔ خیر، کوئی بھی ہو، ظاہر تھا کہ غلط فہمی کا معاملہ ہے لیکن ادھر بی اماں کی نگاہ غضب میرے جسم و جان کے ساتھ دل و جود کو بھی چیر کر پار ہو رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے بچی صاحبہ کی خدمت میں خاموش اپیل کی کہ آپ ہی اماں حضور کا مغالطہ دور کر دیں،

لیکن چھوٹی محترمہ نے جواب میں غیر جانبداری سے مسکرا دیا اور تماشہ دیکھنے لگیں۔ بڑی بی نے
برسا جاری رکھا۔

”دودن سے انتظار کر رہے ہیں۔ اب آتا ہے، اب آتا ہے۔ یہ ہوتے ہیں لچھن
ہونے والے دامادوں کے؟ کہاں ہے تمہاری امی؟“

تو یہ بات تھی! ہم نے بی اماں سے آنکھ بچا کر بچی کو صاف سوالیہ نظروں سے
دیکھا اور پُر زور غیر تحریری احتجاج کیا۔ جواب میں چھوٹی بی نے فقط انگریزی میں شانے سکیڑے
اور آسمان کو تنکے لگی۔ گویا کہتی ہو: ”یہ معرفت کا معاملہ ہے مجھ سے مت پوچھ۔ اپنے من
میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی۔“ ہم نے ایک لمحے کے لیے من میں ڈوبنا شروع کیا تو چھوٹی
بی نے ہماری سادگی پر ایک ہلکا بھلا کا قہقہہ لگا دیا۔ یوں جیسے غلطی سے طبلے پر تھاپ پڑ جائے۔
اس پر بڑی بی چونک پڑیں اور بولیں:

”اری چھو کری تو ہنس رہی ہے! ابھی تو رو رہی تھی۔“

”نانی جان، یہ کیپٹن ظفر نہیں ہیں، کوئی اور ہیں۔ بچی نے ہنسی کو ادھار دے ہوئے کہا۔

”کوئی اور ہیں؟ پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہائے میں نے کتنی غلطی کی۔“

بچی بولی: ”کوئی بات نہیں نانی جان، یہ بھی ہنس رہے ہیں۔“

میں ہنس تو نہیں رہا تھا! البتہ ہنسی روکنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔

نانی جان بولیں: ”بیٹیا معاف کرنا، میری نظر کمزور ہے۔“

نانی جان کی نظر بے شک کمزور تھی، لیکن آپ کی زبان ماشاء اللہ خاصی شہ زور تھی

جسے آسانی سے معاف نہیں کیا جاسکتا تھا مگر اب ہم بھی سراغ پا چکے تھے لہذا معاف کرنا ہی

پڑا۔ اور سراغ یہ تھا کہ یہ خواتین ہمارے دوست ظفر کی منگیتر اور منگیتر کی نانی تھیں اور یہ ڈرامہ

ظفر اور ہماری ہونے والی بھابی کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ظفر کی برات میں شمولیت کی یہ شرط

رکھی تھی کہ ہمیں بھابی جان پیشگی دکھائی جائیں۔ سو ہمیں بھابی جان تو دکھادی گئیں لیکن اس انداز سے کہ ہمارا نانی جان سے بلوہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بے چاری نانی جان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اس ڈرامے میں اُن کا کردار محض قربانی کی نانی کا ہے۔

ایک اور بلاخانہ نوری کی بجائے نوری کے راستے میں آنودار ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں سینئر افسر اکثر انگریز ہی ہوتے تھے۔ ہندوستانی زیادہ تر لفٹین تھے یا کپتان۔ کوئی بھولا بھٹکا میجر بھی نظر آجاتا تھا لیکن کالا لفٹیننٹ کرنل کالے گلاب کی طرح تقریباً ناپید تھا۔ ایک روز دوپہر کی چھٹی کے بعد سائیکل پریس کو جا رہا تھا کہ سڑک پر سامنے سے ایک اور سائیکل سوار آتا دکھائی دیا۔ پاس سے گزرا تو لفٹیننٹ سا نظر آیا جس کے کندھے پر دو پھول ہوتے ہیں ابھی چند گز ہی آگے نکلا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:

“HEY COME HERE” (ارے۔ ادھر آؤ)

مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس گستاخِ ندا کے منادی ہم ہی ہیں۔ حیران کہ یہ صاحب خود کیوں نہیں آجاتے۔ بہر حال ہم ہی بیس قدم پیچھے چل کر اُن تک گئے اور دیکھا کہ اُن کے کندھے کے دو پھولوں میں سے ایک تاج ہے۔ یعنی جناب لفٹیننٹ نہیں، لفٹیننٹ کرنل ہیں۔ میا ہمارا ہاتھ سیلوٹ میں اٹھ گیا اور سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے ہم مؤدبانہ کرنل صاحب کے سامنے اٹن شن ہو گئے۔

ارشاد ہوا: ”جب ہم سامنے آ رہے تھے تو سیلوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟“

کرنل صاحب نے ذرا غیر متوقع پتھر کھینچ مارا تھا۔ فوج میں سینئر افسر کو سیلوٹ نہ کرنا جرم ہے اور اسے جونیئر سے باز پرس کا حق ہے۔ لیکن تجربہ کار افسر اس حق کو عقلمندی سے استعمال کرتے ہیں یعنی جہاں ضبط کا تقاضا ہو سکتی سے گرفت کرتے ہیں، لیکن جہاں یہ فروگزاشت اتفاقاً یا سوا ہو جائے، نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ کرنل صاحب کوئی دوسری قسم کے سینئر

تھے۔ میں جواب دینے میں ذرا جھجکا تو آواز بلند کرتے ہوئے بولے:

”بولو، سیلوٹ کیوں نہیں کیا تھا؟“

عرض کیا: ”میں آپ کا رینک نہیں پہچان سکا تھا۔“

کرنل صاحب رُعب اور فخر سے چوڑھو کر اپنے دائیں کندھے کے تاج کی طرف
ترجیحی نگاہ کرتے ہوئے بولے:

”تمہیں تاج اور پھول میں فرق نظر نہیں آتا؟“

عرض کیا: ”آتا ہے مگر سائیکل تیزی سے جا رہے تھے، اس لیے پہچان نہ سکا۔“
ارشاد ہوا: ”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سوٹے انگریز کے کسی اور کو سیلوٹ نہیں کرتے۔“
یہ کرنل صاحب کی زیادتی بھی تھی اور بے ربطی بھی۔ مجھے کچھ اندازہ ہونے لگا کہ نصیحت
کرنل سہی، مگر عالم بالائیں کچھ بدامنی ہے۔ بہر حال ادب اور سکون سے عرض کیا:
”جناب، یہ مطلب تو نہیں نکل سکتا۔“

جب میں یہ کہہ رہا تھا تو پاس ہی سے ہمارے یونٹ کا ایک انگریز کپتان سائیکل پر
سوار گزرا جس نے حسبِ عادت ہمیں آنکھ ماری جو یقیناً کرنل صاحب کو بھی لگی۔ لیکن اُس
نے کرنل صاحب کو سیلوٹ وغیرہ نہ کیا۔ کرنل صاحب نے مجھ سے مکالمہ جاری رکھا۔

”معلوم ہوتا ہے تمہارا ڈسپلن ٹھیک نہیں ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

نام عرض کیا، لیکن کرنل صاحب نام سے زیادہ یہ پتا ہتے تھے کہ ڈرے، کانپے اور
معافی مانگے۔ جب ایسا نہ ہوا تو آپ نے ذرا زیادہ خوفناک حربہ استعمال فرمایا اور بولے:
”اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ؟“

شناختی کارڈ ہر وقت ہر افسر کے پاس ہوتا ہے۔ جیب سے نکال کر ادب سے
پیش کیا، لیکن کانپنے سے پرہیز کیا۔ آپ نے کارڈ دیکھا۔ پھر اپنی نوٹ بک میں کچھ کوالف

نقل کیے اور کارڈ واپس کرتے ہوئے بولے:

”تمہاری رپورٹ سب ایریا کمانڈر کو کی جائے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

عرض کیا: ”سز میں بھی کچھ عرض کر سکتا ہوں؟“

فرمایا: ”بولو۔“

”سز جب آپ نے سائیکل رُکوا کر مجھے بیس قدم پیچھے طلب فرمایا تھا تو میں نے آ کر آپ کو سیلوٹ کیا تھا، لیکن آپ نے اُس کا جواب نہ دیا۔ میرے سیلوٹ میں کوئی نقص تھا؟“

بولے: ”ہم نے جواب نہیں دیا تھا؟ ہمیں خیال نہیں رہا ہوگا۔“

عرض کیا: ”ایسا ہی ہوگا مگر ابھی ابھی ایک انگریز کپتان بغیر سیلوٹ کیے گزرا، لیکن

آپ نے اُسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ سز گستاخی معاف کیا آپ صرف کالے کپتانوں کو ہی

پکڑتے ہیں؟“

کرنل صاحب کے چہرے پر واضح گھبراہٹ تھی لیکن زبان میں دم تھلا بولے:

”یہ تمہارا بزنس نہیں۔“

میں نے کہا: ”سز شاید آپ کو علم ہے یا نہیں، سب ایریا آرڈرز کی رُو سے سائیکل

پر جاتے ہوئے سیلوٹ کرنا لازم بھی نہیں۔“

کرنل صاحب کو اس سوال کا صحیح جواب نہیں آتا تھا۔ اضطراب میں بولے:

”یہ ہمارا بزنس ہے۔“

عرض کیا: ”مجھے بھی اس واقعہ کی رپورٹ اپنے کمان افسر کو کرنا ہوگی۔ اگر آپ کو

مشکلیف نہ ہو تو کیا میں بھی آپ کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟“

اب اگر کوئی پختہ قسم کا جاندار سا کرنل ہوتا تو پہلے تو سیلوٹ پر جھگڑنے کی طفلانہ حرکت

ہی نہ کرتا اور اگر کر بیٹھتا تو پھر ایک پکڑے ہوئے کپتان کی یہ جرات نہ ہوتی کہ اٹنا شناختی کارڈ

مانگتا۔ لیکن ہمارے دیسی بھائی بظاہر نومو لوڈ سے لفٹیننٹ کرنل تھے اور غالباً اسی خاکسار پر پہلی مرتبہ کرنل آزار ہے تھے۔ یوں تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ کرنل صاحب ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے مسکرا کر ہاتھ ہلاتے اور ہم اپنے ہم وطن کے اوج طالع اور نگاہ التفات پر فخر کرتے ہوئے جوابی ہاتھ ہلاتے، لیکن اب کرنل صاحب گرفت میں تھے تو یہ کھیل کا قصور نہ تھا، خود آپ نے اسے ذرا تنگ لپیٹا تھا۔ کسی قدر جھنجھلا کر بولے:

”اگر تمہارا کارڈ دیکھنا ضروری ہے تو یہ رہا کارڈ۔“

کارڈ دیکھا تو لکھا تھا: ”لفٹیننٹ کرنل ڈی سوزا۔ یونٹ: ملٹری ہسپتال“۔ گویا آپ ڈاکٹر تھے۔ اب لازم نہ تھا کہ آپ کا نام پتہ یاد رکھنے کے لیے ہم بھی نوٹ بک کا سہارا لیتے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی ضیافت طبع کے لیے ہم نے کسی قدر اہتمام کے ساتھ جیب سے نوٹ بک نکالی پھر ذرا خوش خطی سے کرنل صاحب کے کوائف لکھے اور آخر کار سلیقے سے کارڈ تمہارے آپ کے ہاتھ میں دے دیا اور عرض کیا:

”مجھے جانے کی اجازت ہے؟“

کرنل صاحب نے جانے کی اجازت تو دے دی، لیکن اُن کے دل سے بلواؤں پکاراٹھ رہی تھی کہ خدا کے لیے مت جاؤ۔ ہم سے گھر میں ہی صلح کر لو۔
میس میں پہنچا تو کھانے کی میز پر اس حادثہ کا ذکر کیا۔ سامعین زیادہ تر لفٹیننٹ اور کپتان ہی تھے۔ گویا جونیئر افسروں کی برادری تھی۔ ہمارے کارنامے پر خاصاً فخر کیا گیا اور باقاعدہ فتح منائی گئی۔

پہلے پہر اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ کیپٹن چکرورتی آنکلا اور بولا: ”چلو تمہیں چائے پلائیں۔“
ہم فوراً ساتھ ہو لیے کیونکہ چکی کی ٹی پارٹی ہمیشہ پر لطف ہوتی تھی۔ اس کے نصف مہمان صنف نازک سے ہونے کے علاوہ سچ مچ نازک بھی ہوتے تھے جن کی ہم نشینی چائے

کو خوشگوار ذائقہ بخشتی تھی۔

پوچھا: ”آج کس کو بلایا ہے؟“

بولے: ”یہ سربراہ ہی رہے گی۔“

تھوڑی دُور گئے تو چکی بجائے رستوران کے ایک بنگلے میں داخل ہو گیا اور اندر جا کر تے تکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں صاحب خانہ تشریف لائے۔ جی ہاں، یہ لفٹیننٹ کرنل ڈمی سوزا ہی تھے۔ چکی نے باہم تعارف کرایا:

”میرا دلی دوست محمد خاں۔ میرے کرم فرما کرنل ڈمی سوزا۔“

ابتدائی مزاج پُرسیوں کے بعد چائے آگئی اور اس تکلف کے ساتھ کہ رستوران بھول گیا۔ پھر کرنل صاحب کا اندازِ تواضع: چائے پلائی تو شکر گھول دی۔ باتیں کیں تو امرت گھولنے لگے۔ آخر اٹھے تو کرنل صاحب نے آئندہ ملاقات کے وعدے پر اصرار کیا۔ قصہ مختصر باہر نکلے تو معلوم ہوا جیسے دل کا ایک ٹکڑا کرنل صاحب کے گھر چھوڑ چلے ہیں۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ اس منصوبے کا خالق چکرورتی تھا جس کی کرنل صاحب سے پانی دوستی تھی۔ رہا وہ سیلوٹ کا معاملہ تو خدا جانے وہ کن دو آدمیوں کے درمیان ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ جب دو چار ملاقاتیں اور ہو چکیں تو کرنل صاحب اور ہم نے اپنی نوٹ بکوں میں سے ایک ایک صفحہ بطور تعویذ ایک دوسرے کو پیش کر دیا۔

سیالکوٹ کی زندگی میں قاہرہ کا سا تنوع نہ تھا لیکن اس کی محدود دلچسپیاں تمام تر ہماری زد میں تھیں:

_____ وہ باکھلے کلب کی مخلوط پارٹیاں اور مشکوک ملاقاتیں، وہ برج اور فلاش کی مشتبہ نشستیں جن میں سیالکوٹ کے کارخانہ دار اور ان کی بیویاں مقامی افسروں اور ان کی بیگمات کے آگے ہر شب سینکڑوں روپے ہارجاتیں اور قدرتِ الہی سے یہی ہار دوسرے رُز

ہزاروں کی جیت میں بدل جاتی۔

_____ وہ سگنل میس کی رجمنٹل نائٹ کی تقریبات جو رسمی ڈنر کے آہنی قواعد اور شاہی ٹوسٹ کی مقدس رسوم سے گزر کر بھنگڑے اور لڈی پر جانم ہوتیں اور آخری منازل میں ڈھولک کرنل صاحب کے گلے میں ہوتی اور الغوزہ ایڈجوٹنٹ صاحب کے منہ میں۔

_____ وہ مغربی رقص کی خاص راتیں کہ سفید جوڑے شب بھر پیتے اور تھرکتے تھرکتے اور پیتے۔ لیکن دیسی افسر دیوار سے لگ کر وال پیپر بنے رہتے کہ اکثر تو ناچنا ہی نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے اُن کی التجائے رقص بد دماغ میمیں دردِ سر کے بہانے ٹال دیتیں۔ حالانکہ اگلے لمحے میں ہی کسی انگریز کے بازوؤں میں ناچتے ہوئے مجسم اسپرو بن جاتیں۔ اس ہتک پر ہم تمام لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں قومی پیمانے پر اپنی غلامی کا رونا روتے کہ گوری میموں تک رسائی نہ تھی اور کالی بیگیاں ابھی رقص کے میدان میں اُتری نہ تھیں۔ زمیں سخت تھی، آسمان دُور تھا۔

_____ وہ ملٹری ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر مس جیننگ جس کے طاف سرجن

لگنے کے بعد چھاؤنی کے نصف سے زیادہ افسروں کو دردِ دل کے دورے پڑنے لگے اور بڑے دل پکارتے پکارتے اس کے پاس جا پہنچے، لیکن مرض شناس خاتون نے اُن کے دلوں کو ٹٹولے بغیر سوڈا بانی کارب کی پڑیا تھمادی اور واپس کر دیا۔ اور وہ اس خاکسار سے تمام افسروں کی رقابت کہ جہاں مس جیننگ کو دوسرے مریمانِ دل کی پروانہ تھی، ہمارے لیے اُس کا دل نہرو دفا کا باب تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ بالکل صاف ستھری، غیر پوشیدہ اور پڑتال کے لیے کھلی تھی اور وہ یہ کہ ولایت سے ہندوستان آتے وقت جہاز میں مس جیننگ ہماری ہم سفر ہی نہ تھی بلکہ اردو میں ہونہار بروے کی طرح ہماری چکنی چکنی شاگرد بھی تھی۔ سو قدرتی امر تھا کہ اگر اُس کے دشمنوں کی طبیعت کو کچھ ہو جاتا۔ اور اکثر کچھ ہو جاتا تھا۔ تو سعادت مند شاگرد

ٹیتھو سکوپ اٹھائے خدمتِ استاد کو حاضر ہو جاتی۔ بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔
 لیکن سیالکوٹ کی زندگی کی حقیقی مسرت اگر کہیں ملی تو وہ مس جیننگ کے التفات
 یا ڈاکٹر ڈی سوزا کی عنایات میں نہ تھی اور نہ ہی مخلوط کلبوں یا مشکوک پارٹیوں میں بلکہ لفٹننٹ
 کیلاش ناتھ تلواڑ اور ان کی خوش اطوار بیوی کے دولت کدے پر۔ خدا جانے ان دنوں
 نے بل کر دلنوازی کے سلیقے پر کہاں سے چھاپہ مارا تھا کہ کیلاش کی صحبت میں بیٹھو تو قلب
 تسخیر کر لیتا تھا اور بھابی ساوتری بے کلام کرو تو جادو ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں لوگ یا تو پیدائشی
 مہمان ہوتے ہیں یا پیدائشی میزبان۔ یہ میاں بیوی پیدائشی میزبان تھے۔ بخدا ہم پیدائشی
 مہمان تو نہ تھے، فقط یہ کہ تنہا افسروں کو اپنے شادی شدہ دوستوں سے تواضع کی کچھ توقع ہوتی
 ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بھری چھاؤنی میں اس ساری تواضع کی ذمہ داری اس واحد جوڑے
 نے رکھی تھی۔ اگر بقول ابو بن ادہم خدا واقعی ان لوگوں سے پیار کرتا ہے جو اس کے
 بندوں سے پیار کرتے ہیں تو خدا کی فرست میں ۱۹۴۴ء کے بعد ابو بن ادہم سے اوپر بھی
 دو نام ہوں گے۔

قیام سیالکوٹ کے آخری دنوں میں ایک کرنل صاحب جی۔ ایچ۔ کیو دہلی سے
 تشریف لائے اور مجھے حاضری کا حکم ہوا۔ حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ فوج کے محکمہ تعلیم کے
 اعلیٰ افسر ہیں اور چونکہ ہمارے سرکاری اعمال نامے میں تعلیم کے خانے میں میٹرکولیشن کے علاوہ
 کچھ اور بھی لکھا ہے، لہذا وہ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہم سگنل کور کو چھوڑ کر ایجوکیشن کور
 میں آنا چاہیں گے۔ سبز باغ کی سیر کراتے کراتے جناب کرنل صاحب نے باغ کے ایک
 کونے میں ہمیں میجر کی جھلک بھی دکھلائی۔ دل ہی تو تھا، کبخت شوقِ میجر سے بھرا آیا۔
 لیکن ہر چند کہ میجر کی کشش بے پناہ تھی، تاہم سگنل کور سے ترکِ وفا کا تصور بھی بے حد
 جاں گداز تھا۔ چنانچہ ہم نے اقرار تو کر لیا لیکن کچھ ایسا مہم اور عمدہ مناساکہ وقت آنے پر یہی بھی

نکل سکیں اور وہ بھی، اور شارحین کا کسی ایک مطلب پر اتفاق نہ ہو سکے۔ چنانچہ کرنل صاحب
ہمارا یہ وعدہ لے کر رخصت ہو گئے۔ دس دن بعد ہمارا تبادلہ اچانک ایسٹرن کمانڈ
میں ہو گیا اور فروری ۱۹۴۵ء میں ہم عازم کلکتہ ہوئے، گویا ہمارا کرنل صاحب سے کیا
ہوا وعدہ اور پیچیدہ ہو گیا۔

ویکانی سگنل سکول کی کمان

کلکتہ پہنچ کر چیف سگنل افسر بریگیڈیئر ہرسٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بریگیڈیئر صاحب نے خیریت مزاج کے بعد ہم سے گزشتہ تجربے کے متعلق سوالات پوچھے۔ جواب میں ہم نے اپنے اعمالنامے کے چیدہ چیدہ گوشوں سے پردہ سرکایا۔ اعمالنامے میں ایک جگہ رقم تھا کہ اس شخص نے قاہرہ میں مردوں کے علاوہ چند سیودی لڑکیوں کو بھی سگنل کی تربیت دی ہے۔ اس انکشاف پر بریگیڈیئر صاحب پھرک اٹھے۔ مجھ سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور کسی کو مخاطب کیے بغیر بولے:

“JUST THE MAN”

خدا جانے آپ کب سے اس خاکسار ایسے یگانہ روزگار کی تلاش میں تھے۔ اسی خوشی میں آپ نے فون اٹھایا اور رانچی سے کسی کرنل جونز کو فون پر طلب کیا۔ کرنل جونز لائن پر آئے تو بریگیڈیئر صاحب بولے:

”ٹونی، تمہارا مسئلہ حل ہو گیا ہے یعنی تمہاری لڑکیوں کا۔“

”لڑکیوں کا مسئلہ؟“ میں نے دل میں کہا: ”یا الہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اس خاکسار

WAC (I) SIGNAL SCHOOL یعنی زمانہ کور کا سگنل سکول ○

● بالکل وہی جس کی ضرورت تھی۔

اور کرنل جونز کی لڑکیوں میں کیا ربط ہے؟ پھر مسئلہ بھی ایک لڑکی کا نہیں، لڑکیوں کا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور شرع نے کڑی حدیں مقرر کر رکھی ہیں۔“
دونوں انگریزوں کی گفتگو شروع ہو گئی۔ میں صرف برگیڈیئر صاحب کی باتیں سن سکتا تھا۔

”ہاں ہاں، صحیح آدمی مل گیا ہے، یہ بیٹھا ہے کیپٹن خان۔“
”تجربہ؟ ارے میاں، سینکڑوں یہودی لڑکیوں کو ہینڈل کر چکا ہے، تمہاری لڑکیاں اُن سے زیادہ منہ زور نہیں ہو سکتیں۔ ہا ہا ہا۔“
ایسا کرتے ہوئے برگیڈیئر صاحب نے میری طرف اس توقع سے دیکھا کہ میں بھی ہا ہا میں اُن کا ساتھ دوں لیکن میں صرف خنیف سی ہی کر سکا۔ میں نے کبھی سینکڑوں یہودوں کو ”ہینڈل“ نہیں کیا تھا۔ فقط دس لڑکیاں تھیں اور انہیں بھی ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر سبق دیا تھا۔ ہینڈل کرنا محاورہ بھی نا واجب طور پر دُور رس بات تھی۔ برگیڈیئر صاحب بظاہر اُن لوگوں میں سے تھے جو یک لخت مزے میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ اب آپ کرنل جونز کو ہمارے کوائف نہیں بتا رہے تھے، ہمارے متعلق شاعری کر رہے تھے۔

”ہاں ہاں، بالکل آسانی سے، نوجوان آدمی ہے۔ کتنی چھوکریاں ہیں تمہاری؟“
”تین سو ساٹھ؟ پانچ اور کیوں نہیں رکھ لیتے۔ کیلنڈر مکمل ہو جائے گا۔ ہا ہا ہا۔“
”خدا یا تین سو ساٹھ لڑکیاں۔“ ہم نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”ہمارا کیا استعمال ہونے والا ہے؟“

برگیڈیئر صاحب بدستور سخن طراز تھے :
”شادی؟ ہاں ہاں، شادی شدہ ہے۔“ داؤد بجائے اس کے کہ ہم سے تصدیق کرائیں۔ ہمیں آنکھ مار کر خاموش کر دیا، لیکن شادی نہ شادی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہا ہا۔“

(ہمیں دوسری آنکھ ماری)

بالکل بے ارادہ طور پر ہمارے ہونٹ بھی کھل گئے جسے برگیڈیئر صاحب نے
اپنی داد سمجھا۔ بولے:

”ٹوٹی۔ تم خان سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ بڑا نائس فیلیو ہے۔“

ہماری تائش ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سامنے جھک کر آدابِ صن
کوں یا بیٹھے بیٹھے دندکیڑ طاری کر لوں۔ گفتگو جاری تھی:

”آج ہی شام کی گاڑی سے چل پڑے گا اور کل تمہارے پاس ہوگا۔“

ٹیلیفون بند ہوا تو برگیڈیئر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے اور بولے:

”یہ کرنل جونز تھے۔ کے۔ ایل آف سی گنل رانچی کے کمان افسر۔ جونز کی زیرِ نگرانی

جمشید پور میں ایک بہت بڑا ویکائی یعنی لڑکیوں کا ٹریننگ سکول ہے۔ وہی ٹائٹا کی جگہ سیکول
غریب جونز کے لیے دردمسزن گیا ہے۔ کوئی افسر وہاں مہینے سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ لیکن مجھے
یقین ہے کہ تم اپنے بے مثال تجربے کی بنا پر۔۔۔“

افسروں کی بے ثباتی کے متعلق مجھے ٹیلیفون کی گفتگو سے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ باقی

زبانی بتا دیا گیا۔ چنانچہ دوسرے دن میں اپنے بے مثال تجربے سمیت رانچی پہنچ گیا۔ کرنل جونز

سے ملاقات ہوئی تو انہیں بھی برگیڈیئر صاحب کی طرح خوش مزاج پایا لیکن ذرا زیادہ

○ دندکیڑ چکوال کی زبان میں زور سے دانت بھینچنے کو کہتے ہیں۔ ماڑو چکوال کا مشہور بھانڈ

تھا۔ تماشہ شروع کرنے سے پہلے حاضرین کو مخاطب کر کے باوازِ بلند کہتا: ”ہندو رام، مسلمان کلمہ اور

جولا ہے دندکیڑ۔“ اس کے بعد حاضرین سے جولا ہے پہچاننا کچھ مشکل نہ ہوتا تھا کیونکہ چاروناچار بیچاے

دانت بھینچے بیٹھے ہوتے تھے۔

حقیقت پسند۔ بولے:

”خان۔ ویگانی سگنل ٹریننگ سکول کی کمانڈیوں تو دل کش ہے لیکن ذرا

TRICKY ہے، لیکن خیر تمہارے بے مثال تجربے۔“

اگلے روز جمشید پور پہنچا۔ سیدھا دفتر میں گیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کی اینگلو انڈین خاتون مسز پیٹر تشریف فرما تھیں۔ آپ نے کپتانی لگائی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا ہماری نیابت کا کام کریں گی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ تین سو ساٹھ لڑکیوں میں سے ایک سو برسٹش ہیں، ایک سو اینگلو انڈین، ایک سو ہندوستانی اور ساٹھ گورکھا۔ گویا اچھی خاصی زنانہ اقوام متحدہ تھی۔ بطور آفیسر کمانڈنگ سکول کے اندر ضبط، تربیت وغیرہ کی ذمہ داری ہماری تھی لیکن ہوٹل کے معاملات کے لیے مسز پیٹر جواب دہ تھی۔ یہ معلوم ہوا تو ہمارا آدھا در دسر ہلکا ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ لڑکیوں کے نازک مسائل کی جائے پیدائش ہوٹل ہی ہوتا ہے۔ کلاس میں ہوتا ہی کیا ہے؟ سبق؟ اگر کوئی لڑکی سبق بھول گئی تو آفت نہیں آجائے گی۔ جی چاہا تو ذرا غصہ ہو لیں گے ورنہ معاف کر دیں گے۔

ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک صبح سارجنٹ رابن آیا۔ سیلوٹ سے ظاہر تھا کہ کسی کی شکایت لے کر آیا ہے۔ بولا:

”سر، گزشتہ رات کارپورل کلونٹ کور کو ایک خفیہ چھٹی DECIPHER کرنے کو بھیجی گئی۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا: ”جو کچھ کرنا ہے کر لو، کیپٹن خان مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔“

کلونٹ کور نے ایک حد تک درست کہا تھا۔ صرف دو روز پہلے اس کے والد جو جمشید پور میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، مجھے ملنے آئے تھے اور کلونٹ کور کو بھی ساتھ لائے

○ پوشیدہ اشارات و اعداد سے مطلب نکالنا۔

غھے۔ کلونٹ کو ایک دراز قد، جوان سال اور دلاویز سکھ لڑکی تھی۔ اس کے نیم واریلے ہیٹ ہر لحظہ مسکراہٹ پر تلے رہتے تھے۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی ہی لاڈلی تھی۔ لیکن اب فوجی ضبط کا معاملہ تھا۔ چنانچہ کلونٹ کو دفتر میں طلب کیا۔

کلونٹ کو آئی تو ہمارے دفتر میں اس تے تکلفی سے داخل ہوئی جیسے چائے پر مدعو ہوا اور بھی اس نے ہمارے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ہم اس کی خوشبو کے نصف قطر میں آگئے۔ ان حالات میں بے لاگ افسری آسان کام تو نہ تھا لیکن ہم ثابت قدم رہے۔ کلونٹ کو نے رابن کو کھڑے دیکھا تو ذرا ٹھٹکی اور اس پر ایک قرآودہ نگاہ ڈالی۔ پھر اپنی خود رو سگراہٹ کا رخ ہماری طرف موڑا، لیکن ہم اس وقت کرسی عدالت پر بیٹھے تھے۔ کسی جوابی مسکراہٹ کے بغیر خالص فوجی انداز میں کہا:

”کارپورل کلونٹ کور۔ سارجنٹ رابن نے رپورٹ کی ہے کہ تم نے کل شام خضیہ

چٹھی کا صاف زبان میں ترجمہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟“

کلونٹ کو رجھٹ پنجاہی میں بولی: ”حرامی جھوٹ بکدا اے۔“

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس غیر متوقع اور غیر فوجی جواب پر ہم نے سنسی کو کیسے دبایا اور فوجی ضبط کی بجالی کے لیے کس مشکل سے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی کے آثار پیدا کیے۔ سنہلنے میں خاصی دیر لگ گئی لیکن آخر کہا:

”کارپورل کور۔ انگریزی میں بات کرو اور ٹھیک اٹن شن کھڑی ہو جاؤ اور میرے

سوال کا جواب دو۔“

کلونٹ کور کو منجھ سے — یعنی ایک ہموطن سے اور خصوصاً پرسوں کی ملاقات کے بعد — ایسے ٹھیٹ سرکاری سلوک کی توقع نہ تھی۔ کلونٹ کور نے تو رابن سے اس اُمید پر ٹکری تھی کہ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟ لیکن اب ”اُس“ نے ہی لاج نہ رکھی تو

پڑمردہ سی ہو کر رہ گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں۔ میں نے سوال دہرایا۔

”پلیز، بتاؤ کہ سار جنٹ کا حکم کیوں نہیں مانا؟“

کلونٹ کو ربدستور خاموش تھی۔ اُس کی نگاہیں زمین میں گڑی تھیں۔ عدالت نے

سوال جاری رکھے :

”تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تمہیں اپنے قصور کا اعتراف ہے؟“

میرا یہ کہنا تھا کہ کلونٹ کو ر کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ میں نے سار جنٹ

کو باہر جانے کا اشارا کیا۔ اُس کا دروازے سے نکلنا تھا کہ کلونٹ کو ر زار زار رونے لگی۔ اب

عدالت کے سامنے یہ سوال نہ تھا کہ ملزمہ قصور وار ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ ملزمہ عدالت کا قصور

معاف کر کے رونا بند کرے گی یا نہیں، لیکن آنسوؤں کی رفتار سے واضح تھا کہ ملزمہ کا عدالت

کی جاں بخشی کا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم نے کلونٹ کو ر کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں

کُرسی عدالت خالی کر کے ملزمہ کو پیش کی اور اُس سے ضبط کی تلقین کرنے لگے۔

تلقین کے دوران ہمیں گُزرا ہوا زمانہ یاد آیا جب ہم مردوں کی کمانڈ کیا کرتے تھے۔

وہ لوگ جب کسی قصور پر دھریے جاتے تھے تو تازہ وردی پہنے رائٹ لفٹ کرتے کمرہ عدالت

میں داخل ہوتے۔ دو سوالوں کے بعد اکیس روز کی قید کا حکم سُنتے تو پھرتی سے سیوٹ کرتے۔

رائٹ لفٹ کرتے کمرہ عدالت سے باہر نکلتے اور تین ہفتے کو ارٹ گارڈ میں گزار کر ہنستے

کھیلتے یونٹ کی زندگی میں اس طرح شامل ہو جاتے جیسے سینما دیکھ کر آئے ہوں۔ کہاں وہ

سپاہیوں کی کمانڈ اور کہاں ان ویکیٹیوں کی ناز برداری کہ

ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مِس کو ر کے لیے چائے کی پیالی منگوائی۔ اگرچہ حقیقی ضرورت عرق گاؤ زبان مح

خمیرہ مروارید کی تھی۔ مِس کو ر نے دو گھونٹ چائے کے پیے۔ اس کی سبکیوں میں ذرا افاقہ

ہر توہر دو جہاں سے عموماً اور ہم سے خصوصاً تھا ہو کر چل دی۔

اب ہم پر روشن ہونے لگا کہ ہمارے پیشرو صاحبان اس سکول میں ایک مہینہ سے زیادہ کیوں نہیں ٹھہر پاتے تھے اور یہ ابھی ابتداء تھی۔

لڑکیوں کی تعداد کے پیش نظر سکول میں شبینہ کلاسیں بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک شام ہم نے وائٹریس کی کلاس کا چکر لگایا جس میں پندرہ بیس اینگلو انڈین لڑکیاں زیر تربیت تھیں۔ دروازے پر پہنچے تو ایک چھوٹے سے کتے نے باریک مگر مصمم سی بھونک سے ہمارا راستہ روکا۔ ہم ابھی اس پر واضح کر رہے تھے کہ برخوردار کتے یونٹ میں ہی یونٹ کے کمان افسر پر نہیں بھونکتے کہ مکرے سے زنا نہ سرگوشیوں بلکہ بھاگ دوڑ کی آواز آئی اور جب دروازے کے اندر قدم رکھا تو کیا دیکھا ہوں کہ لڑکیاں اپنی آرائش کی چیزیں — لپ سٹک، پاؤڈر، نیل پالش، آئینے — تیزی سے ادھر ادھر مچھپا رہی ہیں۔ آخر جب ہمارے احترام میں ناچار سیٹوں پر بیٹھ گئیں تو معلوم ہوا کہ ہماری ہونہار طالبات آرائش کے مختلف مراحل سے گزر رہی ہیں۔ کسی کے بالوں میں کر ل لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے ایک ہونٹ پر سُرخ ہے لیکن دوسرا فی الحال ابلق ہے۔ کسی نے اپنے چہرے کے لیے کریم نکالی تھی لیکن ہمارے دخل و معقولات کی وجہ سے وائٹریس سیٹ کے عارض ہی طمع کر دیے ہیں۔

تو یہ تھی ہماری وائٹریس کی کلاس؛ کوئی کہ نہ سال اور پکے دل کا کرنل ہوتا تو یہ اذیت فرم دیکھ کر غصے سے لاوا بن جاتا اور ساتھ ہی طالبات کو بھی بھسم کر دیتا۔ لیکن ہمارے پہلو میں ابھی ملام اور جوئیئر سادل تھا۔ چنانچہ ہمارا پہلا رد عمل تو ایک بے پناہ قہقہہ تھا جسے ہم نے چھینکیوں اور کھانسی کی شکل میں خارج کیا۔ پھر اپنی کمان افسری کا تمام تر رعب چہرے پر اکٹھا کر کے کلاس سے پوچھا:

”لڑکیو، تمہارا استاد سارجنٹ رابن کہاں ہے؟“

یہ پوچھ ہی رہا تھا کہ مقابل کے دروازے سے باہر آمدے میں سارجنٹ رابن دکھائی دیا۔ کمرے سے نکلنے کے لیے اچھا بہانہ تھا۔ باہر جا کر رابن سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سارجنٹ رابن نہایت سکون سے قصہ بیان کرنے لگا۔

”سزا آج یہ لڑکیاں گورے پامیوں کے کیمپ میں ڈانس پر مدعو ہیں۔ کلاس ختم ہونے کے بعد انہیں براہ راست وہاں جانا ہے۔ لہذا آرائش کا سامان لے کر یہاں آگئی ہیں۔ کلاس میں آیا تو میں نے بھی وہی کچھ دیکھا جو آپ نے دیکھا۔ مجھے بھی آپ کی طرح ہنسی اور غصہ مل جل کر آئے لیکن لڑکیوں نے مجھے وہ کہا جو آپ کو نہیں کہا۔ یعنی یہ کہ اگر جان کی امان چاہتے ہو تو برآمدے میں کھڑے ہو کر چوکیداری کرو۔ دوسری طرف مس سونیا نے اپنا کتا کھڑا کر دیا۔ شاید آپ کی اس بد تمیز سے مڈ بھڑ ہوئی ہو۔ میں ایک کلونت کور سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ بس سونیاؤں سے کیا الجھتا؟ آپ کو رپورٹ دینا بھی مناسب نہ سمجھا کہ کلونت کور کے بعد آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس وقت آپ کے لیے بیس لڑکیوں کی انک شونی اور چائے نوشی کا انتظام ذرا مشکل تھا۔“

گویا سارجنٹ رابن کو کلونت کور کے قصے کا آدھا نہیں پورا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ کیا گزری تھی قطرے پہ گہر ہونے تک۔ ہم نے سوچا کہ اگر ان بیس اینگلو انڈین قطروں نے بھی گہر ہونا شروع کر دیا تو ہماری کپتانی چائے دانی بن کر رہ جائے گی۔ چنانچہ ناچار اپنی راؤنڈ کے خاتمے کا اعلان کیا اور سامنے ہنستی کھیلتی سونیا کو دیکھ کر اپنی بے بسی کا اقرار کر لیا۔

تری دُنیا میں میں محسور و محکوم

بری دُنیا میں تیری پادشاہی

دو دن خیریت کے گزرے۔ تیسرے دن مقامی فوجی ہسپتال سے ڈاکٹر کا فون آیا۔

”آپ ہی او۔سی دیکھائی سکول ہیں؟“

”جی ہوں۔“

”آپ کے سکول کی دو لڑکیوں نے آج صبح SICK REPORT کیا ہے۔“
”کیا ہوگا۔ خیریت تو ہے؟“

”یوں تو خیریت ہے۔ صرف ان میں سے ایک کے بچے ہونے والا ہے۔ یہ مس جو لیا ہے۔“

خدا جانے میں یہ سن کر گری سے اُڑ کر چھت کو کیوں نہ جا لگا۔ میں نے کہا۔
”کیا فرمایا آپ نے؟ بچہ یعنی۔ یعنی یہاں تو سب لڑکیاں غیر شادی شدہ ہیں۔“
”جی ہاں۔ جھی تو آپ کو بتا رہا ہوں۔ ورنہ یہ خوش خبری براہِ راست مُتے کی ماں کو سنا تا۔ لڑکی سکول پہنچے تو مناسب ایکشن لیں۔“

”مناسب ایکشن؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“

اضطراب میں بھاگ کر مسز پیٹر کے پاس پہنچا اور کہا:

”مسز پیٹر غضب ہو گیا۔ مس جو لیا کے بچے ہونے والا ہے۔“

مسز پیٹر چھوٹتے ہی بولی:

”تو پھر رو کو اُسے۔“ اور یہ کہہ کر مسکرا دی۔

مسز پیٹر کی رگِ ظرافت محض میرا ذاتی اضطراب دیکھ کر بھڑک اُٹھی تھی ورنہ بچے کی آمد ہم دونوں کے لیے مسامی طور پر مضر تھی اور کچھ یہ بھی کہ ہماری کمانڈ میں یہ پہلا حادثہ تھا لیکن مسز پیٹر کی تو یہ کیفیت تھی کہ

ہوتا ہے شب و روز تماشائے آگے

رجسٹر میں کوائف دیکھے تو معلوم ہوا کہ جو لیا کے والدین جمشید پور میں ہی رہتے ہیں۔

○ اپنی بیماری کی ڈاکٹر کو خبر کرنا۔

چنانچہ میں نے فون اٹھایا اور منسٹر پیٹر کو بتایا کہ میں جو لیا کے باپ سے بات کرنے لگا ہوں۔ منسٹر پیٹر بولیں: ”اُدوں ہوں باپ سے نہیں ماں سے“ اور یہ کہہ کر فون میرے ہاتھ سے لے لیا۔ جو لیا کی ماں سے دو پیاری پیاری باتیں کیں۔ کچھ دیر بعد وہ تشریف لے آئیں اور قصہ مختصر اسی شام جو لیا کو لے کر اُس کی خالہ کے ہاں کلکتہ چلی گئیں۔ اس کے بعد ہم نے کچھ نہ سنا۔ سکول کے رجسٹر میں جو لیا کی غیر حاضری کے خانے میں لفظ بد مضمہ لکھا تھا۔ خدا جانے ہم کیا کیا اُمنگیں لے کر کمان کرنے آئے تھے، لیکن ظاہر تھا کہ ان اُمنگوں کے پھلنے پھولنے کے لیے فضا ساز کار نہیں۔ دو چار دن کے بعد رانچی سے ہمارے کپنی کمانڈر میجر شاہانی معائنے کے لیے تشریف لائے اور مشکل میرے پاس بیٹھے ہی تھے کہ گورکھا ونگ سے اطلاع آئی کہ مس لٹا گورنگ پھلی رات سے غائب ہے۔ میجر شاہانی نے میری طرف استفسار نہ دیکھا تو میرے مُنہ سے نکل گیا۔

”وہ ذرا کھٹمنڈو تک گئی ہوگی، آجائے گی۔“

میجر شاہانی یوں بھی سکی سے تھے۔ چڑکے اور بولے:

”تو مس جو لیا شاید لندن تک گئی ہوئی ہیں اور سنا ہے کہ اُن کا پاؤں بھی ذرا بھاری تھا۔“

میجر صاحب معائنے سے پہلے بظاہر خاصی تفتیش کر کے آئے تھے۔ ہم نے ناچار

جو لیا کی اُمیدواری کے سلسلے میں اثبات میں سُر ہلایا۔ میجر صاحب کسی قدر خفگی سے بولے:

”بچہ کیسے ہو گیا؟“

اب اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ مجھ سے مشورہ تو کیا نہیں گیا تھا۔ عرض کیا:

”حسب معمول ہی ہوا ہوگا۔ لڑکی کے چلے جانے کے بعد میں نے تفصیل میں جانا

مناسب نہ سمجھا۔“

”احتیاطی تدابیر کیوں نہ اختیار کریں؟“

میجر صاحب اب بھولی باتیں کر رہے تھے۔ عرض کیا:
 ”ایک احتیاطی تدبیر تو خود سرکارِ برطانیہ نے کی ہے۔ یعنی لڑکیوں کے ہوٹل کے سائے
 میں انگریز سپاہیوں کا رخصتی کمیپ کھول دیا ہے۔“

میجر صاحب بولے: ”سرکاری پالیسی پر نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔“

عرض کیا: ”تو پھر قدرت کی پالیسی پر بھی راضی رہنا چاہیے۔“

قصہ مختصر میجر شاہانی ناخوش ہوئے اور رانچی جا کر کرنل جوئز سے ہماری شکایت کر
 دی۔ ہمیں رانچی طلب کیا گیا اور ہم بہ ہزار شوق و جملہ سامان چل پڑے کہ شاید اس کمان نسواں
 سے امان ملے لیکن کرنل جوئز نے قصہ سنا تو بولے:

”تمہارا کام لڑکیوں کو سگنل کی تربیت دینا ہے۔ سو وہ اطمینان بخش ہے۔ ان کی
 اخلاقی نگرانی مسز پیٹر کا کام ہے اور جمشید پور کے حالات کے پیش نظر یہ بھی معقول ہے باقی
 رہا میجر شاہانی تو وہ JITTERY (ڈرپوک) ہے۔“

یہ تو ٹھیک تھا لیکن میں خود بھی اس زچہ و بچہ کی دیکھ بھال سے رخصت چاہتا تھا
 عرض کیا:

”کیا ممکن نہیں کہ مجھے رانچی میں ہی کوئی مردانہ کام سے دیا جائے؟“

”بولے: ”نہیں ایک سال تک ممکن نہیں۔“

بڑی مایوسی ہوئی۔ سوچا، کون جیتا ہے ان ویکیٹیوں کی زلف کے سر ہونے تک۔
 اگر سال بھر ان کی نگرانی کرتے رہے تو ہم لیڈی ڈاکٹر بن جائیں گے۔ جمشید پور سے بچنے کی
 تدبیریں کرنے لگے۔

دوسرے دن ابھی رانچی میں ہی تھے کہ اچانک ہمیں دفتر میں طلب کیا گیا۔ جی۔ ایچ
 کیو دہلی سے ہمارے متعلق چٹھی آئی تھی کہ اگر یہ افسر ایجوکیشن کو رہیں تباد لے پر رضامند ہے

توفی الفوز پجری میں تعلیمی کورس کے لیے حاضر ہو جائے۔ ایجوکیشن کرنل سے سیالکوٹ والی ملاقات یاد آگئی۔ اُس وقت باوجود میجر کے سبز باغ کے ہمیں گنل کور چھوڑنا شاق نظر آتا تھا اور اب پھر گنل سے قطع تعلق کا خیال ہمارے لیے سوہانِ رُوح تھا لیکن جب دیکھائیوں کے غول اپنے نامعقول آنسوؤں اور نامولود بچوں کے ساتھ ہمارے تصور میں نمودار ہوئے تو ہم پجری جانے کے لیے رضامند ہو گئے اور تیسرے دن وہاں پہنچ گئے۔ پجری کا قیام مختصر تھا۔ دو ماہ کے کورس میں ہم پر فوجی تعلیم کے اسرار و رموز فاش کیے گئے اور کورس کے خاتمے پر ہمیں ایک مستند ایجوکیشن افسر کے طور پر جی۔ ایچ۔ کیو دہلی کے حوالے کر دیا کہ جہاں جی چاہے استعمال کر کے دیکھ لو۔ جی۔ ایچ۔ کیو نے ہماری آزمائش کے لیے برما انتخاب کیا اور ۲۱ جون ۱۹۴۵ء کو ہم کلکتہ سے پرواز کر کے مگھیلہ کے ہوٹل اڈے پر اترے۔

برما۔ بریادی و بجالی میں ہمارا حصہ

برما کی زر خیزی کے متعلق ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ زمین کو گدگداؤ تو تنہا کر موتی بکھیر دیتی ہے۔ جب ہم مکٹیلہ کے ہوائی اڈے پر اترے اور گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو ظاہر تھا کہ اس سر زمین کو ایک مدت سے ہنسنا نصیب نہیں ہوا۔ تین سال کی درناک جنگ سے اس کی کھیتیاں ویران اور بستیاں سنان ہو گئی تھیں اور درناک تریہ کہ اہل برما کے دل ویران ہو گئے تھے۔ اگر کسی لب پر خندہ تھا یا کسی آنکھ میں چمک تھی تو یہ بری لب چشم نہ تھے۔ کوئی امریکی، انگریزی یا ہندوستانی فوج کا فاتح سپاہی ہوگا۔ رہے جاپانی تو وہ برما میں آخری مرتبہ مسکرا چکے تھے اور اب جنگ ہار کر شبِ غم گزارنے کے لیے سیام کو پسپا ہو رہے تھے۔

مضافاتِ مکٹیلہ سے گزرتے ہوئے جا بجا کاسٹلر نظر آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ یہ چند روز پیشتر زندہ جاپانی دلیروں کے سر پر غور تھے لیکن اس وقت برما میں زندہ جاپانی صرف دو قسم کے تھے۔ وہ جو ایران جنگ تھے یا وہ جو اس حالتِ یاس میں بھی کسی کمین گاہ میں

“TICKLE THE EARTH IT LAUGHS IN HARVEST” ○

(GEORGE WEST)

اپنے فاتحین کی خاطر اپنی آخری گولی محفوظ رکھے بیٹھے تھے۔

چنانچہ جس وقت ہم برما پہنچے، ہماری فوج کشت و خون سے تقریباً فارغ ہو چکی تھی۔ ہمارا کام اب برباد برما اور برمیوں کو آباد کرنا تھا۔ گویا خالص تعمیری کام تھا اور یہ تعمیر ہم نے دل و جان سے کی۔ اگرچہ گاہے گاہے وسائل برما کی تعمیر کے ساتھ ساتھ مسائل نفس کی تسخیر میں بھی الجھ گئے۔ لیکن دل ہی تو تھا۔ چنانچہ دوسروں کے حسن کارکردگی کے صدقے خطا کاروں کو بھی مُعاف کر دیا گیا۔ خود غالب نے بھی ان لوگوں کی معافی کی سفارش کی ہے:

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کیسے ؟

اور اہل دل کا ازل سے فتویٰ ہے کہ کچھ نہ کیسے چھوڑ دیجیے۔ چنانچہ چھوڑ دیے گئے یہی خطا پوشی کی پالیسی تھی جس نے برما کے شکستہ و رنجیتہ نظام کو مہینوں میں چالو کر دیا اور ساتھ ساتھ ہمارا اپنا نظام بھی چالو رہا کہ مزدور خوش دل کند کار بیش۔

ہمارا تقریباً ۵۰۵ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں ہوا اور پہلی مرتبہ ہم ٹاٹ انفر یعنی جی تھری (G-3) مقرر ہوئے۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس اسامی میں رہ کر ہمارا مقابلہ جاپانیوں سے بھی قوی تر فینم سے ہے۔ یعنی دفتر کی کرسی سے جو مسل بیٹھک سے ہمارا اجز و بدن بننے لگی تھی۔ ہم آج تک رحمت کی کھلی فضا میں رواں دواں زندگی کے عادی تھے جہاں آبلہ پانی بھی ایک طرح کی رحمت تھی۔ اب آبلوں کی تو یہاں بھی کمی نہ تھی، لیکن غلط جگہ پر تھے اور یہ ایک ایسی زحمت تھی جس سے مجنوں جیسا تم رسیدہ بھی محفوظ رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر اپنے جی۔ ون (G-1) لفٹیننٹ کرنل انگل بی (INGLEBY) سے التبا کی کہ ہمیں کوئی بروڈ در کا کام دیا جائے۔ کرنل صاحب ایک دلنواز سے بزرگ تھے۔ بولے: ”شمالی برما کا دورہ کر لو کہ مختلف یونٹوں کے مسائل سے آشنا ہو جاؤ۔“ اور ایک جیب ہمارے حوالے کر دی۔

ہم نے مہینہ بھر میں مانڈے، میمیو، لاشیو، بھامو، مینیا الغرض آدھا برما چھان مارا۔

برمانوردی کی کچھ یادیں باقی ہیں :

_____ وہ پہاڑوں پر پگھوڑوں کی قطاریں کہ جب تک برمایا پہاڑ ختم نہ ہوں،
پگھوڑے ختم نہیں ہوتے۔ برما کے پہاڑوں نے جہاں کہیں کہنی نکالی ہے یا سر اُبھارا ہے
ماتما بدھ کے شیدائیوں نے اسے پگھوڑے کی ٹوپی پہنا دی ہے۔

_____ وہ سڑک پر جا بجا بدھ کے سیرین (SERENE) اور سکون بخش
مجھے کہ ہم بُت شکن بھی پاس سے گزرتے تو شانتی محسوس کرتے۔

_____ وہ مانڈلے میسوکو کی سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل کہ جس سے نیگ
کرسانپ بھی سڑک پر آنکلتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے ہم جیپ سواروں سے اپنی حسرتوں
کے لیے ڈسٹول مانگ رہا ہے۔

_____ وہ سیپا کے دیوداروں کے سلسلے، گویا دیووں کے دیار میں جانکلے تھے۔
_____ وہ برما روڈ کے ناگمانی موٹر جن کی گولائیوں سے خبردار کرنے کے لیے
امریکی انجینئروں نے عام نشانوں کی بجائے بے لباس حسیناؤں کی تصویریں بنا دی تھیں۔

_____ وہ لاشیو میں ایک چینی رئیس کے ہاں دعوت چائے کہ جس کی لطافت
نے تمام تر غبارِ خاطر دھو ڈالا اور وہ کیف و سرور بختا کہ قلعہ احمد نگر کے اسیروں کو بھی رشک آئے۔
_____ اور آخر میں ہمارے یونیٹوں کے مسائل جن کی خاطر یہ سفر اختیار کیا تھا۔

ہم جہاں بھی گئے جانوں کو شاداں پایا اور کیسے نہ پاتے؟ راشن کی فراوانی، پیسوں کی بکیرانی
اور سب سے بڑھ کر آٹھ پہر کی حکمرانی۔ تعمیر ملک جو کر رہے تھے۔ چنانچہ واپس آکر ہم نے سب
اچھا کی رپورٹ دی تو ہمارے انگریز سینیئر نے ہمیں شاباش دے کر ہماری ترقی کی سفارش
کر دی۔ گویا شمالی برما میں خیر و عافیت ہمارے دم قدم سے ہی تھی۔

ادھر چانگ حکم شائع ہوا جس کی رُو سے ہمارا تبادلہ مکھیلہ سے مانڈلے کر دیا گیا۔

یوں سمجھیں جیسے جہلم سے راولپنڈی۔ مانڈے کے متعلق اپنے گاؤں کے ایک جہاں گروتا جہلم سے سُن رکھا تھا کہ دلی کی طرح ایک شہر ہے عالم میں انتخاب۔ اور یہ کہ رہتے ہیں منتخب ہی وہاں روزگار کے۔ لیکن جا کر دیکھا، خصوصاً اس کے قلعہ معلیٰ کو تو محسوس ہوا کہ انتخاب ضرور رہا ہوگا لیکن شاہ مندان کے زمانے میں ہی۔ اب تو فلک کے علاوہ جاپانیوں اور انگریزوں نے اُسے اس تفصیل سے دیران کیا تھا کہ اس اُجڑے دیار میں گھاس کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا اور اب اس کے بلیوں یعنی ہم لوگوں کا مدار اس گھاس کے کھوٹے پر ہی تھا کیونکہ ڈاکٹر وکیل کے کہنے کے مطابق یہ گھاس ٹائفس بردار جراثیم سے اُٹی پڑی تھی۔ چنانچہ پہلے چند ماہ ہمارا شغل گھاس کھونا ہی رہا اور ظاہر ہے کہ اس رُوپ میں ہمیں کوئی بے کلیم مہاجر ہی منتخب روزگار سمجھ سکتا تھا۔ بہر حال جب چھ ماہ کی مسلسل کھدائی کے بعد مانڈے کی صحت بحال ہو گئی اور ہمارے حلیے میں منتخبان روزگار کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو یکایک ہمارے ہیڈ کوارٹر کو مانڈے سے میمیو جانے کا حکم ملا۔ مانڈے سے میمیو جانا بالکل ایسا ہی تھا جیسا راولپنڈی سے مری جانا۔ مری کی طرح میمیو بھی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک خوش مزاج سا شہر ہے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ایک برطانوی ٹیلین رنگون سے میمیو منتقل ہوئی تھی تو اُن کے خون کو گرمانے کے لیے ہماری فوج کے انگریزی روزنامے SEAC نے اپنے مخصوص مغربی بے حیائی کے انداز میں یہ سُرخ جمانی تھی:

”مژدہ جو انہ۔ میمیو کی چھ سودو شینز ایں تمہارے لیے چشم براہ ہیں۔“

اس بات کو دو مہینے ہو چکے تھے اور ہر چند کہ اب منتظر آنکھوں کی تعداد اور شوق میں خاصی کمی کا امکان تھا تاہم ایک مہینہ سی توقع تھی کہ میمیو کے دروبام سے کوئی بچی کھچی آنکھ ہمارے انتظار میں بھی داہوگی اور کسی نہ کسی درتپے سے ہمارے مقدم میں بھی کسی رُو مال کو جنبش

○ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ

آئے گی لیکن میمیو پہنچے تو کسی آنکھ کو یہ کہتے نہ سنا کہ تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ۔ میمیوں درتچے کھلے پائے۔ لیکن کسی ایک میں بھی ساکن یا متحرک رُومال دکھائی نہ دیا جس کا رُوئے سخن ہماری طرف ہو۔ اور آخر جب ایک کھڑکی میں سچ مچ ایک رُومال ہلتا نظر آیا تو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ کسی معصوم کا دُھلا ہوا نیپکن سوکھ رہا ہے۔ گویا اس گھر میں بھی عشق و محبت کی داستان بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ ظاہر تھا کہ میمیو میں زندگی کی رفتار زندہ رہنے کے لیے کافی نہیں۔

بات یہ تھی کہ برما کے باقی شہروں سے کچھ زیادہ میمیو کا حسن اور شباب جنگ کی نذر ہوا تھا۔ میمیو کی خوشگوار ہوانے جاپانی فوج کے تمام تر ہوس پرستوں کو کھینچ لیا تھا چنانچہ اب حُسن میں رنگ تھا نہ شباب میں اُمنگ۔ اگر اس وقت غالب میمیو آسکتے تو دیکھتے کہ ابرو نے ہاتھ سے کمان رکھ دی ہے اور غمزے نے کمر سے خنجر کھول دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں نہ گناہ میں لذت ہے نہ ثواب میں سُور۔ یہاں دوکانداری سے لے کر عشق بازی تک نقطۂ انجماد سے نیچے کے ماحول میں ہو رہی تھی۔ چنانچہ پہلے دن میمیو میں داخل ہوئے تو ہمارے دلوں پر اوس کے علاوہ کچھ اولے بھی پڑے اور ہم دن بھر سُر کو زانو پر دھر کر بیٹھے سوچتے رہے۔ لیکن ہمارا ہیڈ کوارٹر جس میں پچاس سے زیادہ افسر اور سینکڑوں متعلقین تھے بیکار اور زندہ دل فاتحین کا ٹولہ تھا۔ انہوں نے اولے اٹھا کر فلک کو دے مارے۔ ادھر میمیو کے حزن خانے میں بھی کئی سدا بہار قسم کے لوگ تھے جو عارضی طور پر خواب سرمایہ مدہوش پڑے تھے۔ وہ جاگے اور ہر دو عناصر کا اتصال ہوا تو میمیو میں زندگی نے آنکھ کھولی۔ پہلے برف پگھلنا شروع ہوئی۔ پھر بہار نے کروٹ لی اور دنوں میں سنان محلے چھپانے لگے۔ دفعۃً میمیو نے تیغ نگاہ کو آب دنیا شروع کیا اور اس کے گلی کوچوں میں فتنہ ساماں چلیں تانے بننے لگیں۔ ہار کورٹ بٹلر جھیل کی مچلتی سطح پر حشر ماجرا کشیاں کھینے لگیں۔ ریس کورس کا زنگارنگ

ہجوم واضح طور پر جوڑوں میں تقسیم ہونے لگا۔ ہمارے ہیڈ کوارٹر کے مرد کلرک غائب ہونے لگے۔ ان کی جگہ دھان پان برمی اور اینگلو برمی لڑکیاں لینے لگیں اور ہمارے کائی آلود دفاتر کشت زعفران میں تبدیل ہونے لگے۔ حوالدار کلرک بتا سنگھ کی جگہ مس پرل کا آنا گویا ایک بنٹے کی جگہ گوہر کا آنا تھا۔ یہ گوہر کیپٹن گرین (GREEN) ویلفیئر افسر کے حصے میں آیا اور جن جذبات سے کیپٹن صاحب نے دوستوں میں مس پرل کی آمد کا ذکر کیا وہ انگریزی الفاظ میں تھے لیکن فیض انہیں اردو کا لباس بھی پہنا چکے ہیں یعنی جیسے دیرانے میں چپکے سے بہا آجائے

کیپٹن گرین اس اینگلو برمی حسینہ کے سحر میں ایسے کھوئے کہ کچھ عرصہ بعد خداوندان فوج کو انہیں حکماً جدا کرنا پڑا۔ کیونکہ کیپٹن صاحب کے سوا باقی تمام فوج کے ویلفیئر کا کام دھک سے رُک گیا تھا۔

ہماری اپنی کلرک ایک نرم و نازک خالص برمی لڑکی تھی، ماکن جی۔ جتنا پیارا نام تھا اتنی ہی نازک اندام تھی۔ ٹائپ کرنے کو ایک ڈرافٹ دیا تو ٹائپ کرنے کے علاوہ اصلاح بھی کر لائی۔ تعلیم پوچھی تو معلوم ہوا انگریزی میں ایم۔ اے ہے۔ جی چاہا اپنی کرسی خالی کر دی۔ لیکن ماکن جی بہت سنبھلی ہوئی لڑکی تھی۔ بولی: "آپ کو کرسی مبارک۔ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلنے والی ہے۔ میں جلد ہی اپنی کرسی پر چلی جاؤں گی۔ یعنی بطور لیکچرار۔ جنگ کے دنوں میں بیکاری کی بجائے نوکری کر لی کہ اس میں پیسوں سے زیادہ عافیت کا پہلو تھا۔"

ماکن جی کو بھی ہماری طرح ٹوجو سے کوئی عناد نہ تھا۔ محض حالات کا ساتھ دے رہی تھی۔ میسوکے دیرانے میں بہا آئی تو ہمارے لیے پھولوں کی بجائے تاج لائی یعنی ہماری موعودہ پر موشن کا حکم آگیا اور ہم میجر بن گئے۔ کندھوں پر میجر لگا کر دیکھی تو محسوس ہوا

○ زمانہ جنگ میں جاپان کے مشہور وزیر اعظم۔

کہ وزن بڑھ گیا ہے۔ آپ کسی تازہ میجر سے پوچھیں۔ پروموشن کی آج کل بھی یہی تاثیر ہے اور ہمیں میجر کی کانشہ کچھ اس لیے بھی گہرا محسوس ہوا کہ ہمارے تین ماتحت کپتانوں میں سے دو انگریز تھے۔ وہی انگریز جن کی ملازمت کرتے کرتے ہم نے لاکھوں کے بول سے تھے۔ یوں تو جنگ انگریز کی تھی۔ ہم دیسی اُن کے سینئر ہو کر لڑتے یا جو نیر ہو کر بہر حال اُن کی خاطر ہی لڑے تھے لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ انگریز افسروں کو چاروں شانے ماتحت پایا اور انہیں سیلوٹ کرتے اور اُس سرکٹے سنا تو وطن کی غلامی کا کچھ غم ہلکا ہو گیا۔ جی تو چاہتا کہ ان سے کوئی ٹھوس سا تصور سرزد ہو تو انہیں سزا دے کر تھوڑا سا جلیانوالہ کا بدلہ بھی لیا جائے لیکن انگریز کم بخت اتنا اچھا حاکم نہیں جتنا اچھا ماتحت ہے۔ ایسی بے عیبی سے ماتحتی کرتا ہے کہ انتقام لینے کی بجائے انعام دینے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ انگریز ماتحتوں سے ہمارے تعلقات چارونا چار دوستانہ ہی رہے۔

ہمارا تیسرا ماتحت ایک دیسی کپتان تھا لیکن اس قدر پیارا رفیق ثابت ہوا کہ ہمارے باہمی رشتے سے افسری ماتحتی خارج ہو گئی۔ یہ تھا رام لعل گڈ ہوک۔ خوش طبع۔ وجیہہ رینق آفری اور شریہ۔ مجھ سے پہلی مرتبہ برہا ہی میں ملا۔ ایک کپتان میں اتنے اوصاف کا جگمگا دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آخر یہ کہاں کی مٹی ہے اور پوچھا تو وہیں کانکلا جہاں کا ہونا چاہیے تھا یعنی چکوال کا۔ یوں بھی خاکِ وطن کا مجھ کو ہرزہ دیتا تھا۔ رام لعل ایک بالکل گرائس دیوتا ٹیکل پڑا۔ میسوی زندگی پہلے ہی پھولوں سے عبارت تھی، رام لعل کی زندہ دلی نے اسے مسلسل پھل پھری بنا دیا۔

کبھی کبھی یہ پھل پھری پوری آتش بازی کی شکل اختیار کر لیتی مثلاً جب کبھی تمام ہندوستانی افسر میس میں مل کر انگریزوں کو سنانے اور سنانے کے لیے ”برما کی لونڈیا“ کا کورس گاتے تو کیپٹن

○ تقسیم ملک کے بعد ان سے رشتہ کٹ گیا۔ معلوم نہیں آج کل کیا اور کہاں ہیں۔

● آج کل لٹینٹ کرنل محمد امین آرمی سروس کور۔

محمد امین کی سربراہی میں وہ اودھم مچاتے کہ انگریزوں کو اپنی ہندوستانی ایپاٹری کی بنیادیں ہلتی نظر آئیں اور وہ چاروناچار ہمارے کورس میں شامل ہو کر چلانے لگتے:

”ملٹی ہے چہرے پر مٹی ٹالاب کی“

یاجب کبھی میجر شنگھاڑا سنگھ پنجابی میں گوندھی ہوئی انگریزی میں حالاتِ حاضرہ پر لیکچر دیتے۔ اُن دنوں کیبنٹ مشن دلی آیا ہوا تھا۔ اس سلسلے کے ایک لیکچر میں آپ نے راجہ غضنفر علی خان اور لارڈ پٹیٹک لارنس کا ذکر کرنا تھا۔ ان ناموں کے تلفظ کے متعلق لیکچر سے پہلے اس خاکسار سے مشورہ کرنے آئے۔ آپ غضنفر کو غنفر، روزن تنفردا کرتے تھے۔ میں نے اسی تلفظ کی پر زور تائید کر دی اور کہا کہ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔ پٹیٹک لارنس وہ صحیح طور پر ادا کرتے تھے لیکن میں نے مشورہ دیا کہ آپ پٹیٹک لارنس کہیں تو گرامر کی رو سے زیادہ فصیح ہوگا۔

سردار صاحب دام میں آگئے۔ سینکڑوں دیسی اور انگریز افسروں کے سامنے نہایت خود اعتمادی سے غلط تلفظ دہرانے لگے۔ پہلی مرتبہ سامعین ذرا مسکرائے لیکن سمجھے کہ شاید سردار صاحب کی زبان کی لغزش ہے مگر جب فاضل مقرر نے غضنفر علی خان اور پٹیٹک لارنس کی بوجھاڑ شروع کر دی تو پتہ چلا کہ سردار صاحب کی زبان نہیں دماغ لغزش کر رہا ہے۔ پھر شنگھاڑا سنگھ کا اندازِ خطابت! معلوم ہوتا تھا انگریزی میں بانی پڑھ رہے ہیں۔ سننے والے ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگے۔ چند ایک نے ہمت کر کے سردار جی کے تلفظ کی اصلاح کی کوشش کی لیکن شنگھاڑا سنگھ نے اپنے اصلاح کنندوں پر حقارت سے ہنستے ہوئے ہمیں آنکھ ماری اور اپنے معترضین کو ڈٹ کر کہا:

○ یہ نام ہم لوگوں کا دیا ہوا تھا۔ آپ کا اصلی نام کچھ اور تھا۔

● PATHETIC یعنی قابلِ رحم

”پترو۔ پہلے گرامر پڑھ کر آؤ۔ پھر غلطی نکالنا۔“

اور اپنا لیکچر جاری رکھا۔

لیکن میميو اور مانڈے کی گیتوں بھری کہانی میں گڈ ہوک۔ امین اور شنگھار سنگھ کے

علاوہ چند اور شاہیر کا حصہ بھی تھا۔ مثلاً

_____ لفٹیننٹ ریاض احمد خاں افسر کمانڈنگ سپلائی ڈپو مانڈے جو برمی

بادشاہوں کے بعد قلعہ مانڈے کے پہلے شاہی قسم کے مکین تھے۔ آپ کے دربار میں اور

دستر خوان پر صلائے عام تھی لیکن آپ کی نازک مزاج جیب مسماۃ رانی (جو برما کی جیبوں

میں فرسٹ لیڈی سمجھی جاتی تھی) آپ کے سوا صرف ایک اور بار لطیف کی متحمل ہو سکتی تھی۔

وہ بار لطیف بتدریج بیگم ریاض کی شکل اختیار کر گیا۔

_____ لفٹیننٹ عصمت اللہ چوہدری جن کی موجودگی میں کسی محفل، گاؤں یا

قریے کا بے رونق رہنا ناممکن تھا۔ آپ کو بیوقوف ڈھونڈنے اور بیوقوف بنانے میں الہامی

دسترس تھی۔ حتیٰ کہ آپ نے شوخ و شنگ گڈ ہوک کے دل پر بھی چرکہ لگا کے چھوڑا۔ لیکن ان

چرکوں ہی سے تو برما کی محفلیں رنگین تھیں۔

_____ میجر چندرا (ڈٹرنزی کور) میرے شریف روم میٹ تھے مگر ایک اوباش

کتے مسمی پلیر کے مالک تھے۔ چندرا خود بھوبٹی قسم کے آدمی تھے لیکن پلیر کے معاشقے زبان زد

میميو تھے۔ پلیر صبح و شام رفیقہ حیات کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور دوسرے کتوں اور

ان کے مالکوں کے امن میں مغل ہوتا، لیکن جب ہمایوں کے گلوں سے تنگ آ کر چندرا پلیر کو سزائے

کرتا تو بے چارا خاموشی سے سر جھکائے مالک کی تلخ ترش باتیں سنتا رہتا۔ آخر حجاز ختم ہو چکی تو

○ بعد میں میجر ریاض احمد خان اے سی ایس۔

● اب لفٹیننٹ کرنل عصمت اللہ چوہدری اے۔ ایس۔ سی۔

آنکھ کھولنا اور صبر و رضا کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھنا۔ گویا کہتا ہو:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

اور پھر اولین فرصت میں چند را سے آنکھ بچا کر شہر میں عشق کرنے نکل جاتا۔

اور آخر میں قبلہ و کعبہ لفٹینٹ کرنل سید حیدر علی گریزی کمان افسر فیڈ

ایمبولنس کلاء جو برما کمانڈ کے ہر ہندوستانی افسر کو تعارف سے پہلے ہی دل میں جگہ دے دیتے تھے۔

یونٹ کے لوگ آپ کو کمان افسر سے زیادہ پیرو مشد سمجھتے تھے۔ آپ اکثر ملتان کی زبان میں کلام کرتے

جو ہمیں انگریزی کی طرح مشکل لگتی اور کبھی انگریزی بولتے تو اس کی ملتان بنادیتے اور اپنے انگریز

سامعین کو مستقل طور پر ہراساں رکھتے۔ آپ کی ہر بات اور ہر حرکت میں تفریح کا پہلو تھا لیکن بھولے پن

کا یہ عالم کہ سنہی کی بجائے پیارنا دل کے اتنے صاف جیسے معصوم بچہ اور مزاج کے ایسے شیریں جیسے

نادار دوشیزہ۔ جو دیسی یا بدیسی افسر ایک مرتبہ آپ سے مل لیتا آپ کا مدح سرا ہو جاتا۔ لیکن

کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

ہمارا برما کا قیام ڈیڑھ سال کا تھا جو گویا ڈیڑھ لمحے میں گزر گیا اور چانک ہمارا تبادلہ فریڈ کو

میں پشاور ہو گیا۔ پارٹیوں کے ایک ناگزیر سلسلے سے گراں شکم مگر سرفرونگے اور آخر میمو کو الوداع

کہی۔ میمو سے رنگون تک جیپ میں سفر کیا اور دیکھا کہ ہمارے قیام کے دوران برما کے ہتھیار ختم

بھرائے ہیں۔ سربراہ برمی بچوں کو دیکھا تو ان کے گالوں میں انگارے تھے۔ جوان مٹیاریوں

کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں تارے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف اہلما تے دھانوں کے کھیت

دھوپ میں یوں جھللا رہے تھے جیسے بزازِ فطرت نے حدِ گاہ تک بزرسان کے تھان کھول رکھے

ہوں۔ ہم نے دل ہی دل میں رُو صحبت برما سے کہا کہ شاید تجھے احساس ہو یا نہیں مگر

ہمارے اشک تری ماقت سنوار چلے

○ آج کل کوڈور (برگیڈیئر) سرجن جنرل پاکستان نیوی۔

برما سے پاکستان براہِ مدراس

رنگون سے بھری جہاز میں سوار ہوئے اور ایک مختصر سے سفر کے بعد مدراس کے ساحل پر اترے۔ بظاہر تو ایک غیر ملک سے وطن کو لوٹے تھے لیکن وطن کا یہ حصہ برما سے کم اجنبی نہ تھا۔ برما کی زبان کا صوتی حلیہ ”چوہ۔ پوہ۔ اوئی۔ ٹوئی۔ کھ۔ پھ“ تھا اور تامل کا ”گرگرم۔ ینگلم۔ ٹنگا۔ پنگا۔ ائے۔ پئے“ گویا دونوں زبانیں ہماری اُردو یا پنجابی آوازوں سے تقریباً دو ہزار کالے کوس دور تھیں لیکن غنیمت تھا کہ مدراس اور ننگور کے ہفت روزہ قیام میں جن لوگوں سے واسطہ پڑا یعنی ہوٹل کے بیرے وغیرہ سب انگریزی بولتے تھے، اگرچہ عجیب غیر جانبدارانہ انداز میں مثلاً ہوٹل سے باہر جانے لگے تو بیرا بولا:

”ماسٹر، کس وقت آئے گا؟“

ہم نے کہا: ”کونسا ماسٹر؟“

بولا: ”ماسٹر“ اور ”ماس“ پر ادب سے زور دیا۔

ہم سمجھے خدا جانے کس بلا کا ذکر کر رہا ہے۔ ہم نے لاپرواہی سے کہہ دیا ”ماسٹر و اسٹر

نہیں آئے گا۔“

سلام کر کے چلا گیا۔ جب واپس آئے تو بیرا غیر حاضر پایا۔ اگلی صبح غیر حاضری کی وجہ

پوچھی تو بولا:

”ماستر نے خود ہی تو کہا تھا کہ نہیں آئے گا۔“

ہمیں اب معلوم ہوا کہ کبھی ماسٹر کے ادب کے ہمارے لیے صیغہ حاضر کی بجائے غائب استعمال کر رہا ہے اور یہ کہ ماسٹر سے مراد ہم خود ہی ہیں لیکن وہ سکول والے ماسٹر نہیں بلکہ آقائے ولی نعمت قسم کے۔ ہمیں انگریزی زبان کی کم مائیگی پر رحم آیا کہ بڑی مہذب اور شائستہ بنی پھرتی ہے لیکن کسی کو تعظیم سے مخاطب ہی نہیں کیا جاسکتا اور اپنی اردو پر پیار آیا جس نے لفظ ’آپ‘ ایجاد کر کے بے ادبی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ خواہ ظلِ سبحانی ہی کیوں نہ مخاطب ہوں، بالمشافہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ غالباً مغربی زبانوں میں ’آپ‘ کے مقابلے میں کچھ نہیں۔

چنانچہ ہمارا مدراس کا قیام نہ تو گورنر کی رُو سے خوشگوار تھا، نہ عام بُو دو باش کے اعتبار سے۔ مثلاً راہ چلتے ہوئے آپ کو ایک معزز آدمی سوٹ ٹائی پہنے ہوئے ملتا ہے لیکن نیچے پاؤں سے ننگا ہے۔ آپ اس بے رطلی پر حیران ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ مسخرہ کون ہو سکتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ موصوف مسخرے نہیں، ہائی کورٹ کے جج ہیں اور اگر آپ بڑھ کر ان سے اسم گرامی پوچھتے ہیں تو حضور فرماتے ہیں:

”یَم۔ یف۔ یندرم۔“ اگرچہ حقیقت میں ہزلارڈ شپ کا مطلب ہے ”ایم۔ ایف۔

اندرم!“

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے:

اور اندازِ گفتگو یہ ہے کہ مدراس میں الف اگر کسی لفظ کے شروع میں آنے کی گستاخی کرے تو اُسے ہی بنا دیا جاتا ہے۔ ہمیں مدراس اور بنگلور میں کوئی ہفتہ بھر نہیں کریا روکر گزارنا تھا وہ گزارا اور آخر ۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو پشاور کے اسٹیشن پر فرنیچر میل سے اترے۔ معاً ہمیں چھ سال پہلے کا پشاور آنا یاد آیا۔ اُس وقت ہم کچی کلی کی مانسردو دن کے

نرم و نازک سے نیم لفظیں تھے اور اپنے انگریز استقبال کنندوں کی سردہری سے کُلا سے گئے تھے لیکن اب ہم میجر تھے اور خیال تھا کہ ذرا فرانت بھی ہیں۔ آخر دو محاذوں پر جنگ لڑ کر آئے تھے۔ چھاتی پر اُدے اُدے، نیلے نیلے، پیلے پیلے تمغوں کی پوری ڈیڑھ قطار تھی۔ انگریزوں میں رہ کر انگریزی عادات اور فرانات پر بھی اب خاصا عبور تھا۔ استقبال کے لیے اس دفعہ بھی ایک انگریز میجر آیا، لیکن ہمیں محسوس تک نہ ہوا کہ گورا ہے یا کالا۔ منٹوں میں ہیلو اولڈ بوئے سے گزر کر چند ناقابل تحریر کلمات سے تعارف کی منزلیں طے کر ڈالیں اور جب سرو ہوٹل میں ایک کمرے میں اپنا سامان اتار تو میجر مور ہمارے بے تکلف یار تھے۔

دوسرے روز یونٹ میں جانے کا ہمارا پہلا دن تھا۔ ہمارے ایسا پردھوبی نے ہماری وردی کو اکڑایا، بیرے نے چھولوں کو چمکایا، ہم نے سینے کو پھلایا، مٹھوڑی کو اٹھایا، نیم کو پچکایا اور اپنے نئے یونٹ کو روانہ ہوئے۔ ہمیں خیال تھا کہ یونٹ کے دروازے پر کوارٹر گارڈ ہوگی۔ ہم بحیثیت فیلڈ افسر اس کی سلامی لیں گے اور کور کمانڈر صاحب سے ملاقات ہوگی لیکن جہاں ہمارے رہانے کا روکی وہاں کوارٹر گارڈ کا نشان تک نہ تھا بلکہ مجلس قانون ساز کی عمارت تھی۔ اتنے میں ایک مزمی پوش جوان آگے بڑھا اور کار کا دروازہ کھول کر بولا:

”پرخیر اعلیٰ“ (خوش آمدید)

ہم نے کہا: ”ہم یہاں نہیں آئے۔ ہمیں فرنٹیئر کور جانا ہے۔“

بولا: ”ہم دغدے“ (وہ یہی تو ہے)

حیرت ہوئی کہ اتنے بڑے ہیڈ کوارٹر کے لوازمات کیا ہوئے؟ نہ کوارٹر گارڈ ہے، نہ سنتری، نہ اٹن شن، نہ سیوٹ، یہ کیسی فرنٹیئر کور ہے؟ آگے دفتر کے اندر گئے تو سب فوجی افسر سوٹ پہنے، ٹائیاں لگائے بیٹھے تھے۔ گویا اسمبلی کے ممبر ہیں۔ ہمیں دیکھا تو سب نے ایک متحہ قہقہہ لگایا اور میجر مور جو ان میں سے ایک تھے، ہمیں مخاطب کرتے ہوئے پریڈ گراؤنڈ کے

انداز میں بلند آواز سے بولے :

”سٹینڈ آئیٹ ایز۔ سٹینڈ ایزی۔“

جو اب ہم نے صبح کا روکا ہوا سانس خارج کیا۔ مٹھوڑی کو حسبِ منشا لٹکنے کی اجازت دی۔ شکم کو حدِ امکان تک پھیلنے کی رخصت دی اور اُن کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ فرنیٹر کور کا ہیڈ کوارٹر سفید پوشوں کا ادارہ ہے۔ وروی صرف قبائلی علاقے میں سکاؤٹ اور ملیشیا کے یونٹوں میں پہنی جاتی ہے۔ ہیڈ کوارٹر فقط چار پانچ افسروں پر مشتمل تھا جن کے دفتر کے لیے صوبائی اسمبلی کی عمارت سے تین چار کمرے اُدھار پر لیے گئے تھے۔

اُس زمانے میں فرنیٹر کور پر انگریز افسر قابض تھے۔ ویسی افسر کوئی ایک آدھ ہی لیا جاتا تھا اور ہزار مشکل سے۔ بلکہ انگریز بھی خاندانی واسطوں اور پُرانے افسروں کی سفارش پر لیے جاتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ لیے جانے کے بعد بقول شخصے لاٹ کے پچھے بن جاتے تھے اور باقی افسروں کو عوام سمجھنے لگتے تھے۔ اس کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ یہاں آکر تنخواہ میں تین چار سو روپے کا اضافہ ہو جاتا تھا بلکہ قبائلی معروکوں کے انگریز نامہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے سکاؤٹ اور ملیشیا کی زندگی کو ایک گہرا انسانی رنگ دے رکھا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب پیچھے ہوم کو کھاٹریاں ددرہ خیر، شورنگی، فقیرا پٹی اور دوسری قبائلی جنگوں کے اصلی اور فرضی قصے لکھ کر بھیجتے تو انگریز مائیں اور معشوقائیں سمجھتیں کہ بیٹیا یا محبوب لارنس آف فرنیٹر ہو گیا ہے اور یہ مغالطہ خود انگریز افسروں کو بھی خاصا موافق آتا۔

ویسے قبائلی گستاخوں کی زندگی میں کسی قدر رومان اور افسانے کا شائبہ بھی تھا۔ چنانچہ جب ہم نے اپنے تقرر کے کاغذات پیش کیے تو ہمیں اپنی خوش نصیبی سے بالتفصیل آگاہ کیا

○ یہ دو سال بعد کی بات ہے کہ فرنیٹر کور کا دفتر بالا حصار میں منتقل ہوا جہاں ہم پہلے

آباد کاروں میں سے تھے۔

گیا۔ یوں جیسے ٹونی آرمسٹرانگ کی طرح ہمارا بھی شاہی خاندان میں رشتہ ہو گیا ہو۔
 کرنل ہیرسین کو تو یقین ہی نہ آتا تھا کہ کسی اُدھر کے اشارے کے بغیر ہمیں فرنٹیئر کور کے
 قابل سمجھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ وہ نہ سکا تو ہم سے رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔
 ”یہ گھپلا کیسے لگا؟“

اب ہم فرنٹیئر کور میں آئے تو اس وجہ سے تھے کہ اس اسامی پر بہ طور کسی دیسی کو
 ہی آنا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دیسی ہم نکلے لیکن کرنل ہیرسین کے جواب میں ہمارے
 سامنے گپ لگانے کے لیے لامحدود میدان تھا۔ ہم نے سنجیدگی سے کہا:
 ”مجھے خود سمجھ نہیں آتی سوائے اس کے کہ برائیں لارڈ مونٹ بیٹن سے ایک ملاقات
 میں فرنٹیئر کور کا ذکر آیا تھا۔“

ہمارا یہ کہنا تھا کہ کرنل صاحب جھٹ بول اُٹھے:

“THAT IS IT”

بھولے کرنل صاحب! مونٹ بیٹن سے ملنا تو درکنار ساری جنگ میں ہمارا اور
 مونٹ بیٹن کا درمیانی فاصلہ کبھی تین سو میل سے کم ہی نہ رہا تھا، لیکن اب حکایت شروع ہو
 چکی تھی اور ہم سے ملاقات کی تفصیل کے لیے اصرار کیا جا رہا تھا چنانچہ ہم نے مناسب کسر نفسی
 مگر خاصے نامناسب مبالغے کے ساتھ ایک دلکش سا افسانہ پیش کیا۔ مونٹ بیٹن کے ساتھ
 بے تکلفی کا قصہ سنا تو انگریز سامعین سہم سے گئے۔ گویا کہہ رہے ہوں:

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قصہ مختصر دفتر بند ہونے سے پہلے ہمیں نہ صرف فرنٹیئر کور کی برادری میں لے لیا گیا

بلکہ ہماری اچھی خاصی دستار بندی بھی کر دی گئی۔

○ یہی تو بات ہے۔

دوسرے روز برگیڈیئر ایمروز (انسپیکٹر جنرل فرنٹیئر کور) سے ملاقات ہوئی۔ انگریز دورے کو کامیابی کی کنجی سمجھتا ہے۔ حسب توقع ہمیں حکم ملا کہ کام شروع کرنے سے پہلے تمام ملیشیا اور سکاؤٹ یونٹوں کا دورہ کر لو، پھر کام شروع کرنا۔

اس چھوٹے سے حکم کی تعمیل خاصی طویل اور ثقیل تھی۔ یعنی قبائلی علاقے کے طول و عرض میں کوئی تین ہزار میل کا جالا بنانا تھا۔ اس وقت فرنٹیئر کور میں آٹھ دس یونٹ تھے جو شمال میں گلگت سے لے کر جنوب میں چمن تک بکھرے پڑے تھے۔ اگر پی آئی اے کے نقشہ ساز ہمارے سفر کا نقشہ دیکھ لیں تو رشک کے مارے اپنے ڈیک پر ہی کرش (CRASH) ہو جائیں۔ اس سفر میں چند روایتی صعوبتیں ضرور تھیں لیکن قبائلی تواضع اور کیپٹن مومن شاہ کی رفاقت نے انہیں سر نہ اٹھانے دیا۔ مومن شاہ ہمارے نائب تھے۔ قد کے چھوٹے ہونے کے بعد ذرا اور بھی چھوٹے تھے۔ یہی کوئی پانچ فٹ صفر پانچ۔ لیکن دل کے بڑے ڈبل پٹھان تھے۔ یعنی وہ چند خوبیاں جو اور پٹھانوں میں فرداً فرداً ملتی ہیں ان میں یکجا تھیں۔ شریف مگر غصیل، مہمان نواز مگر تشنہ انتقام، جاں نثار مگر زود رنج۔ ان خالص سچتوں عادات کے علاوہ ایک عادت بہادر سیکھ دوستوں سے بھی مستعار لی تھی۔ یعنی کوئی کام ہو مستعدی سے کر ڈالتے تھے اور پھر آرام سے سوچتے رہتے تھے کہ کیسے کرنا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ آپ سلیکشن بورڈ کے سامنے گئے۔ آپ کو دیوار ”الف“ سے دیوار ”ب“ پر دو زینوں کی مدد سے زمین کو چھوئے بغیر پہنچنا تھا۔ کوئی سترہ فٹ کا فاصلہ تھا اور زینوں کے استعمال میں تھوڑی سی چالاکي درکار تھی۔ اب سیدھے سادے پٹھان کو چالاکيوں سے کیا واسطہ؟ آپ نے اللہ کا نام لیا اور دیوار ”الف“ سے براہ راست دیوار ”ب“ کے لیے چھلانگ لگا دی۔ بعد میں اگر آپ کی ٹانگوں کو کوئی آنچ نہ آئی تو یہ آپ کا قصور نہ تھا۔ یہ پٹھان ٹانگوں کا عدم تعاون تھا۔ ہفتہ گزر چکا تو کہنے لگے :

”یارا، وہ زینہ دوسرے زینے میں پھنسا لیتا تو سیڑھی سیڑھی دیوار تک پہنچ سکتا تھا۔“

آپ کا ہفتے کے بعد بھی اتنا سوچنا غنیمت تھا۔ کیونکہ عام حالات میں آپ کی دو سوچوں کے درمیان خاصا طویل وقفہ ہوتا تھا۔ لیکن کیپٹن مومن شاہ کی یہی سادگی اور صاف باطنی ہی تو تھی جس نے ہمارا دل موہ لیا۔ وہ نہ صرف اپنی خوبیوں بلکہ خامیوں کی وجہ سے بھی پیارے لگتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ہمارے خانہ دل کے کلین تھے اور آج تک وہیں رہتے ہیں۔ دورے کی ابتداء لنڈی کوتل سے کی۔ جاتے ہوئے درہ خیبر سے گزرے جس سے ہمارا پہلے بھی تعارف تھا لیکن گزشتہ چھ سالوں میں درہ خیبر نے جنگ کی اس قدر تیاری کر لی تھی کہ سچا پاناہ جاتا تھا۔ سڑک پر جا بجا روڈ بلاک رکھے تھے۔ نیچے نالے میں ٹینکوں کی رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ یوں جیسے کنکریٹ کی کھمبیاں اُگ آئی ہوں۔ اب تو سچ مچ درہ خیبر سے گھٹانچ کر نکلتی تھی اور ہوا تھرا کے چلتی تھی۔ لیکن ہمارا معاملہ ہوا سے ذرا مختلف تھا۔ ہم فرنٹیئر کور کے افسر تھے اور درہ خیبر کے سگے رکھوالے، سوبے باکانہ سینہ اُبھار کر چلے۔

لنڈی کوتل پہنچے تو جس کو آرٹری گارڈ کے معائنے اور سلامی کا انتظار یا اشتیاق تھا، موجود پائی۔ فارغ ہوئے تو انگریز کرنل سے تبادلہ خیالات ہوا اور محسوس ہوا کہ جب اس نے ہمیں چائے پیش کی تو خود خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ کیونکہ فرنٹیئر کور میں دو دوسری افسروں کے آنے کا یہ مطلب تھا کہ سلطنتِ برطانیہ کے کم از کم دو سومز مع میل پر سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے۔ کیپٹن مومن شاہ نے تو کرنل صاحب سے یہ سوال بھی پوچھ لیا کہ ”کرنل صاحب! آپ اپنا فیملی ولایت کب نیچے (نیچے) گا۔ ادھر تو اب گرمی آنے والا ہے۔“ اُس

○ انگریزوں کا خوف بالکل بجا تھا۔ پانچ ماہ بعد ہی پاکستان وجود میں آ گیا اور انگریز افسر یا تو رخصت ہو گئے یا ہمارے خانہ زادوں میں شمار ہونے لگے۔

وقت اگر کوئی کرنل صاحب کو تھرمامیٹر لگاتا تو تھرمامیٹر کھول اٹھتا۔ کرنل صاحب کی گرمیاں
آپکی تھیں!

لنڈی کوتل سے پاراچنار گئے۔ کوہاٹ اور تھل کے سنگستان سے گزر کر دریائے
گرم کی وادی میں داخل ہوئے تو ہم پر اس مقام کا راز کھلا جہاں اقبال حسن بے پروا کو
بے حجاب دیکھ کر اس سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے
کہ بن؟ پاراچنار کا حسن کشمیر سے بھی زیادہ بے آلائش ہے۔ ہم نے پورے تین دن گرم ملیشیا
اور اس کے کاروبار کا جائزہ لیا۔ آخر دورے کا بھی کچھ مقصد تھا۔ لیکن وہاں سے رخصت
ہوئے تو حاصل دورہ گرم ملیشیا کے اعداد و شمار نہ تھے بلکہ رنج پاراچنار کے نقش و نگار، جو
آج تک ذہن سے محو نہیں ہو سکے۔

پاراچنار سے سنگینوں کے سائے میں بنوں اور میر علی کے راستے میراں شاہ پہنچے۔
یہ وہی میراں شاہ تھا جہاں سے ہم نے چھ سال پہلے جنگی زندگی کی ابتداء کی تھی یا انگریزوں نے
کرائی تھی کہ ایک دوسرا انگریز پشاور جا کر برنج کھیل سکے۔ اُس وقت ہم نیم لفظین تھے اور
عالی دماغ میراں شاہ کو ہماری آمد و رفت کا احساس تک نہ تھا۔ اب میراں شاہ کے قلعے
میں قدم رکھا تو ٹیپچی سکاؤٹس کے کمان افسر کرنل سینڈسین خود خیر مقدم کو آئے اور میراں شاہ
نے تو گویا اپنا اعمال نامہ کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور ہم نے بکمال فیاضی اُس کے تمام
پچھلے گناہ معاف کر دیے۔

قبائلی سرداروں کو ہماری آمد کا علم ہوا تو ہم تواضع کے ہاتھوں محصور سے ہو گئے۔
وہ صوبیدار میجر سے لے کر سپاہیوں تک کی طرف سے دعوتیں، وہ پیٹ بھر جانے پر ہمارا مزید
کھانے سے انکار اور میزبان کا فقط ایک سالم دُنبہ اور کھلانے پر اصرار وہ رات کو جانوں کا بلبند
○ بلبند پشتوں میں رقص و سرود کی محفل کو کہتے ہیں۔

اور دن کو زبانوں کا زلزلہ۔

— دوسرے روز دفتر میں کرنل صاحب سے تعلیمی معاملات پر بحث ہوئی تو ہمارے علم و فن سے بہت مرعوب ہوئے۔ لہجے کے وقت میس میں تکرار کا ذکر چل نکلا تو مختلف پرندوں کے نام لیے جانے لگے۔ اس ضمن میں کرنل سینڈلین ایک پرندے کا اردو نام پوچھ بیٹھے جسے انگریزی میں بسٹرڈ (BUSTARD) کہتے ہیں۔ اس خاکسار کا علم و فن جواب دے گیا اور لاعلمی کا اظہار کرنے والا ہی تھا کہ مومن شاہ نہایت آرام سے کسی قدر عالمانہ انداز میں بولے:

”اُردو میں اسے ناجائز اولاد کہتے ہیں“

کرنل سینڈلین اُردو سے خاصے آشنا تھے۔ ہماری سخن فہمی اُن پر آشکارا ہوئی تو مضمون بدل کر موسم کی بات کرنے لگے۔ حسبِ معمول کوئی مہینہ بھر بعد کیپٹن مومن شاہ ہنس کر کہنے لگے۔

”یارا، وہ بسٹرڈ کے معنی خوہ ٹیک (ٹھیک) نہیں تھے۔ یہ داؤس تو پرندہ ہوتا ہے۔“

میرا شاہ کے بعد ہماری منزل جنڈولہ تھی۔ پہنچے تو شام کا وقت تھا۔ شام کے دھندلے میں جنوبی وزیرستان کے کوہ و دمن خیبر سے بھی زیادہ دلکش نظر آتے ہیں۔ وہی عظمت اور وہی شانِ دلاویزی، لیکن بہت بڑے پیمانے پر۔ ہمارے دل نے اس کشش کی شدت محسوس کی۔ جنڈولہ کے قلعے میں داخل ہوئے تو اس کے وسیع صحن میں سبز گھاس پر دس بارہ انگریز افسر بیس بائیس مختلف النسل کتوں کے دائرے میں آرام کرسیوں پر بیٹھے پی رہے تھے۔ ہمیں داخل ہوتے دیکھا تو خیر مقدم کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ انگریز نہیں گتے! اور گرم جوشی مگر خاموشی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اچھے انگریز اپنے کتوں کو بھونکتا دیکھیں تو انہیں جنگلی

○ ہمارے کان پشت سے تازہ تازہ آشنا ہو رہے تھے۔

کہتے ہیں اور اچھے کہتے اس نکتے سے آشنا ہیں۔ لہذا اول تو بھونکتے ہی نہیں اور ایمر جنسی میں کچھ کرنا ہی پڑے تو بقول پطرس ہلکی سی بھج کر دیتے ہیں۔

انگریزوں کے قریب پہنچے تو انہیں اپنے کتوں سے بھی زیادہ کم گو پایا۔ لیکن ان کی کم گوئی تہذیب کا تقاضا نہ تھا بلکہ جلاپے کا اظہار تھا۔ اس قلعے میں آج تک کوئی غیر انگریز داخل نہیں ہوا تھا سوائے اس کے کہ بے راہو یا اردلی۔ اور آج یہ مقدس روایت جب ٹولہ کی نرم و نازک گھاس کے ساتھ پامال ہو رہی تھی۔ ایک انگریز میجر نے بصد مشکل کیپٹن مومن شاہ کو پشتو میں کچھ کہنے کی زحمت گوارا کی کہ اپنے بیروں خانساموں سے بولنے کا یہی انگریزی دستور تھا۔ کیپٹن مومن شاہ نے نہایت سُستہ انگریزی میں جواب دیا:

○

“WOULD YOU MIND SAYING THE SAMETHING IN ENGLISH?”

YOUR PUSHTO IS A LITTLE TOO GOOD FOR ME”

طوطے اڑنے کا محاورہ سُن رکھا تھا۔ آج ہم نے سچ مچ طوطے اڑتے دیکھے انگریزی طوطے! اس کے بعد انگریزوں نے ہم پر حسب توقع دانت تو پیسے لیکن ادب اور قرینے سے۔ جنوبی وزیرستان کے قبائلی جوانوں کو جب علم ہوا کہ دیسی مسلمان افسر آئے ہوئے ہیں تو ہمیں ملنے کے لیے بے تاب ہونے لگے۔ ہم نے یہ تقریب دوسرے روز نمازِ جمعہ تک اٹھا رکھی اور جب سکاؤٹوں کی مسجد میں گئے تو سینکڑوں صحت مند اور کسرتی سکاؤٹوں کی شوخی معانقہ کے بعد پہلیاں نقش فریادی بن کر رہ گئیں۔ اور ”جوڑ تگڑا۔ ڈیز تگڑا“ کی تکرار سے زبان بل کھا کر پیچھا رکیل کی شکل اختیار کر گئی۔ قبائلی علاقے میں اخوتِ اسلامی کا اظہار اچھا تھا جمانی بلکہ پہلوانی معاملہ ہے۔ ملاقات کے جوش و خروش کے بعد جب ان لوگوں کی تعلیم کے متعلق

○ کیا آپ یہی بات انگریزی میں کہنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ آپ کی پشتو میری

فہم سے ذرا بالاتر ہے۔

استفسار کیا تو پتہ چلا کہ وزیرستان کی بارش کی طرح یہاں کی تعلیم کی اوسط بھی کوئی ایک انچ سالانہ کے لگ بھگ ہی ہے۔

الغرض یہی کیفیت ثرو بلیشیا (فورٹ سنڈے مین) اور پشین سکاؤٹس (چمن) میں نظر آئی۔ انگریز افسر ناخوش، پٹھان سپاہی خوش۔ علم کی قلت، حلیم کی کثرت، معانقوں کی شدت اور پسلیوں کی شامت لیکن دوسری طرف چترال اور گلگت گئے تو ان لوگوں کا مزاج کسی قدر مختلف پایا۔ یہاں کا درجہ حرارت اور درجہ انخوت دونوں مقابلتاً ملائم تھے۔ لوگ بامروت تھے لیکن مروت کے انہما سے ہڈی پسلی پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ چائے یہ بھی پلاتے تھے لیکن بڑی حلیم سی جو بیشتر زرد رنگ کا بے ضرر سا شیر گرم پانی ہوتا تھا جسے بڑی تواضع سے پیش کرتے تھے۔ وہ درہ کو ہاٹ والا اُبلتا ہوا سیاہ لاوانہ تھا جو جناب میزبان ہزار پیوند پیالیوں میں کم و بیش ڈنڈے کے زور سے پلاتے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں سے خونخواری کی بجائے خاکساری ٹپکتی تھی۔ رہی تعلیم تو وہ یہاں بھی اتنی ہی جوڑنگڑی تھی جتنی خیبر اور وزیرستان میں۔

آخر سر حد پیمائی ختم ہوئی تو کوئی مہینہ بھر بعد ہم پشاور لوٹے۔ اب ہمارا کام فریڈیک کو کے ہمتن کورے جو انوں کے لیے ایک تعلیمی منصوبہ تیار کرنا تھا۔ حقیقت میں ایسے اہم کام کے لیے تو لارڈ میکالے یا مسٹر شریف کی ضرورت تھی۔ بھلا ہم خاک نشین سپاہیوں کو تعلیمی اصلاحات سے کیا رشتہ؟ لیکن حکم حاکم تھا اور ہمیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ہماری قابلیت کے مقابلے میں کام اگرچہ مشکل ہے لیکن ہے کرنے کے قابل۔ لہذا ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُس محنت سے کام لیا جسے شاقہ کہتے ہیں اور قبائلی جو انوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے اپنا تمام تر زورِ قلم بلکہ خونِ جگر صرف کر کے ایک سکیم بنا ڈالی۔ پھر پورے جوش اور واجبی فروش کے ساتھ اسے عملی جامہ پہنانا شروع کیا اور نتیجہ یہ رہا کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم خود جابے سے

باہر تھے۔ خوشی سے نہیں پینے سے! بالغ کو پڑھانایوں بھی مشکل کام ہے۔ لیکن بالغ بھی ہو اور بچان بھی تو پھر یہ کام کسی مشکل کشا کے بس کا ہی ہوتا ہے۔ ہم یوں تو کچھ نہ تھے لیکن غلام مشکل کشا ضرور تھے۔ اللہ کا نام لیا اور خیر سے لے کر چمن تک قبائلی سپاہیوں پر در علم واکر دیا۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ہمارے تیار کردہ زیورِ تعلیم نے قبائلی زندگی میں کیا آراستگی پیدا کی، ہمارے لیے کچھ کتنا مشکل ہے لیکن ہماری سکیم آج تک رائج ہے اور کیپٹن مومن شاہ اور ہم کبھی کبھی چپکے سے ایک ناروا سا فخر بھی کر لیتے ہیں کہ شاید

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یہ اور بات ہے کہ جریدہ عالم کا قبائلی صفحہ کسی کی نظر سے گزرے گا یا نہیں۔ لیکن قاری محترم اس فخر پر تعلق کا گمان زہار نہ کیجیے گا۔ ہم نے زندگی میں اگر کوئی جاندار کارِ خیر کیا ہے تو وہ یہی ہے اور عاقبت میں ہمارے پاس کچھ اثاثہ ہوگا تو یہی سکیم ہوگی۔ گویا یہی ہماری مسدس حالی ہے۔ ہاں ایک اجر ہمیں اسی دُنیا میں فوری طور پر بھی مل گیا یعنی پشتو سیکھ لی اور ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ پشتو بولنا بھی کس قدر مقوی ٹانیک (TONIC) ہے۔ ہوکنہ؟

اُن دنوں ملک میں ایک سیاسی انقلاب کروٹ لے رہا تھا۔ قائدِ اعظم اور پنڈت نہرو دلی میں لارڈ مونٹ بٹن سے مل کر انگریزی راج کا قصہ تمام کر رہے تھے اور اُڑتی سی خبر تھی کہ ملک آزاد ہونے والا ہے۔ ادھر اچانک ہمیں حکم ملا کہ ۶ جون ۱۹۴۷ء کو ریگولر کمیشن کے امتحان کے لیے سلیکشن بورڈ میرٹھ کے سامنے حاضر ہو۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو رات کی گاڑی سے جانا تھا لیکن معلوم ہوا کہ اُسی روز ہمارے سیاسی رہنما آل انڈیا ریڈیو دلی سے ایک اہم اعلان کرنے والے ہیں۔ چنانچہ دوپہر سے ہی ریڈیو سے لگ کر بیٹھ گئے۔ پہلے مونٹ بٹن بولے، پھر پنڈت نہرو اور اُن کے بعد قائدِ اعظم۔ ہم نے ابھی تک قائدِ اعظم کی تقریریں صرف اخباریں میں ہی پڑھی تھیں لیکن آج پہلی مرتبہ اُن کی پُر شکوہ آواز سنی تو ہمارے سینوں میں توانائی

آنے لگی اور اپنے قائد پر بے حساب فخر محسوس ہوا۔ لیکن قائد کی آواز سے بھی زیادہ نشاط انگیز وہ مردہ تھا جو ان کی تقریر کا موضوع تھا۔ یعنی یہ کہ دو ماہ بعد ۱۴ اگست کو پاکستان قائم ہونے والا تھا۔

اس ایک پیام سے ہماری تو دنیا ہی بدل گئی اور فوراً اپنے آپ سے پہلا سوال یہ کیا کہ اب میرٹھ جا کر یعنی ایک غیر ملک میں ریگولر کمیشن لینے کے کیا معنی؟ کیوں نہ پاکستان بن لے اور خالص پاکستانی امتحان میں شرکت کریں، لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ابھی دو ماہ تک انگریز کاراج ہے لہذا انگریزی امتحان ہی دینا پڑے گا۔ چنانچہ ناچار اسی رات میرٹھ روانہ ہوئے۔ میرٹھ میں امتحان سے فارغ ہو کر پشاور لوٹے تو اپنے ساتھ ریگولر کمیشن کے علاوہ اپنا پرانا دوست ٹالسٹاٹس بھی لے آئے۔ دو ہفتے بعد پشاور کے ملٹری ہسپتال سے رخصت ہونے لگے تو انگریز رس نے جس نے چوری چھپے ہمارے خطوط پڑھنے کے علاوہ یاد بھی کر لیے تھے، ہمیں مری میں گرمیاں گزارنے کا مشورہ، حکم اور دھمکی ملا جلا کر دیے اور ٹرانس جرنل کے کان میں ایک ایسی جھپتی سی سرگوشی کی کہ غریب نے فی الفور ہمارے لیے چھٹی کی سفارش کر دی اور خود ہفتہ بھر کان میں گلیسرین ڈلوانا رہا۔ چند روز بعد ہم مری میں تھے۔

سیل ہوٹل مری کا کمرہ نمبر ۲۶ ایک منکسر مزاج سائنگل کمرہ ہے لیکن ہمارے لیے عظیم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کمرے میں ہم پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی صبح طلوع ہوئی۔ اسی کمرے میں ریڈیو پاکستان کا پہلا نشر یہ سنا۔ گویا اسی کمرے میں وطن عزیز کی آزادی کی ابتداء ہوئی۔ مگر اسی کمرے میں اپنی آزادی کا خاتمہ بھی ہوا۔ یعنی وہ خاتون جو اس شب ہمارے ساتھ شریکِ بزم تھی دوسرے روز شریکِ حیات بن گئی اور وہ آزادہ ریفرنڈم کے قباہرہ سے لے کر ماٹڈ لے تک عشق کی دسترس سے محفوظ رہا تھا، مری پہنچ کر

اسیرِ لُفت ہو گیا۔

بڑی مُدت کے بعد آخروہ شاہیں زبردِ دام آیا
اور یہاں سے ایک دُوسری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

اُردو کے مزاحیہ ادب کی مقبول ترین کتاب

بجنگ آمد

کریم محمد خان

ایک نیم نشین کی شوخ و شنگ سرگزشت